مجلس ادارت

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کردیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف ۱۹۸۲ء سے لے کر ۱۹۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانی کے تمام مضامین جمع کردیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کردیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپے۔

"منیجر"

جلد ۱۴۵ ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۹۰ء عدد ۴

مضامین

شذرات

اس وقت جبکہ مسلمانوں کے سروں پر ادبار کی گھٹا چھائی ہوئی ہے، اور فلاکت اپنا سماں دکھا رہی ہے، پھر بھی نہ ان میں حرکت و بیداری ہے، اور نہ ان کے جمود و تعطل میں کوئی کمی ہو رہی ہے، محنت و مشقت، جفاکشی اور جد و جہد کے بجائے ان میں تن آسانی، آرام طلبی اور عیش کوشی بڑھتی جا رہی ہے، سستی اور کاہلی ان کی علامت بن گئی ہے، اور وہ طاؤس و رباب کے دلدادہ ہو گئے ہیں، خود فریبی نے ان کو اس منزل پر پہونچا دیا ہے کہ

ع۔ عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

زندگی کے ہر شعبہ اور مسلمانوں کے سارے طبقوں کی یہی کیفیت ہے، چاہے وہ مزدور اور کاریگر ہوں یا تاجر اور زراعت پیشہ ہوں، ملازم ہوں یا کسی آزاد پیشہ سے وابستہ، استاد ہوں یا طالب علم، سب محنت و ریاضت سے گھبراتے ہیں، حد یہ ہے کہ ان کے لیڈر گفتار کے غازی تو بن گئے ہیں مگر کردار کے غازی نہیں بن سکے ہیں، ان کی زندگی تضاد اور دو رخے پن کا نمونہ ہوتی ہے، قوم و ملت کی خدمت کا دعوی صرف زبانی ہے، وہ اپنے معمولی اور ادنیٰ فائدے کے لیے قوم و ملت کے مفاد کا بے دھڑک سودا کر بیٹھتے ہیں، جس قوم کے درد و غم میں اشکبار ہو کر راتوں کو اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے ہیں، صبح کو دیکھیے تو یہ سارا جوش و خروش ختم ہو چکا ہوتا ہے، جس ملت کے درد سے بظاہر ان کا سینہ پھٹا جا رہا ہے اسی ملت کا

کوئی فرد ان کے آرام میں خلل انداز ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

مسلمانوں کی دوسری خرابی اختلاف و انتشار ہے جو ہر سطح پر پایا جاتا ہے، یونیورسٹیوں اور کالجوں سے لے کر اسکولوں، مدرسوں، مکتبوں، مسجدوں، غرض پبلک زندگی کا کوئی میدان بھی اختلاف آرا، نفاق انگیزی اور ہنگامہ آرائی سے خالی دکھائی نہیں دیتا، حقیقت یہ ہے کہ قوم کے منتشر افراد کو جوڑنے اور متحد رکھنے والی چیز اعتقاد، خیال اور مقصد کی وحدت ہوتی ہے، جب کسی قوم کے افراد میں کسی اعتقاد، خیال اور مقصد کے لیے ایسی وحدت پیدا ہو جائے جو اس کے منتشر افراد کو شیرازہ بن کر ایک دوسرے سے اس طرح جوڑے اور پیوستہ رکھے کہ ان کی زندگی اور موت اور ساری سعی و کوشش، جد و جہد اور دوڑ دھوپ اسی ایک غرض اور مقصد کے لیے ہو تو اس قوم کی قوت ناقابل تسخیر ہو جاتی ہے، اور اس کی راہ کا ہر روڑا دور ہو جاتا ہے، لیکن اگر قوم کے اغراض و مقاصد مختلف ہوں اور اس میں اخلاص و خدمت کا جذبہ مفقود اور ذاتی مفاد قومی مفاد پر مقدم ہو جائے تو ہوا کا ایک معمولی جھونکا بھی اسے تباہ کر دیتا ہے۔

حضرت مسیح ؑ کا ارشاد ہے کہ "آدمی صرف روٹی سے نہیں بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے"، قومیں بھی اپنے عقائد و ایمانیات، اصول و نظریات اور روایات و خصوصیات پر ثابت و قائم رہنے سے زندہ اور باقی رہتی ہیں، اگر کوئی قوم ان کے بارے میں شک و تذبذب میں مبتلا ہو جائے تو اس کی تباہی یقینی ہو جاتی ہے، دوسروں کی تقلید و نقالی سے بھی قومی وجود ختم ہو جاتا ہے، اور نقال قوم دوسری قوم کے اندر ضم ہو کر رہ جاتی ہے

اس وقت مسلمان اسی صورت حال سے دوچار ہیں، اعتقاد و ایمان کے بارے میں تذبذب اور دوسروں کی نقالی نے ان کا ڈھانچہ اور ہیولیٰ تبدیل کر دیا ہے، در اصل مسلمانوں کا خمیر عقائد و اصول سے تیار ہوا ہے جن کو مضبوط اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مسلمانوں کی اصلی صورت اور ان کا اپنا ہیولیٰ مسخ ہونے سے محفوظ رہے۔

اردو زبان کے صاحب طرز اور جادو نگار ادیب و انشا پرداز، ملک کے مشہور فلسفی و صحافی اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم پر اتر پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام ۱۹، ۲۰ مارچ کو ایک سمینار ہوا جس کا افتتاحی جلسہ سہکارتا بھون لکھنؤ میں ہوا اور اتر پردیش کے گورنر جناب بی. ستیہ نرائن ریڈی نے اس کا افتتاح کیا جو اردو کے صحافی و شیدائی ہونے کے ساتھ ہی مولانا کے بھی عظمت شناس ہیں، ڈاکٹر محمد یونس کے خطبۂ استقبالیہ میں مولانا کی عظمت و کمال کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک اہم اور ضروری سفر پر روانہ ہو جانے کی بنا پر جلسہ کی صدارت نہیں فرما سکے، تاہم ان کا پُرمغز خطبۂ صدارت ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی نے پڑھا، جنھوں نے خود بھی تفسیر ماجدی پر ایک اچھا مقالہ پیش کیا اور دو روزہ سمینار کے جلسوں میں دلچسپی سے شریک ہوتے رہے۔

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ مسٹر ملائم سنگھ یادو اور وزیر مملکت واوقاف محمد اعظم خان کی تقریریں بھی افتتاحی جلسہ میں ہوئیں، وزیر اعلیٰ نے مولانا کی تصنیفات کی طبع و اشاعت کیلئے اپنی حکومت کا تعاون بھی پیش کیا، اس کے بعد اردو اکادمی ہال میں تین جلسے ہوئے جن میں مولانا کی ادبی، صحافتی اور تفسیری خدمات پر اچھے اچھے مقالے پڑھے گئے، لکھنؤ جیسے علمی ذوق رکھنے والے شہر میں ایک نامور ادیب پر ہونے والے جلسوں میں معاصرین و سامعین کی اتنی کم تعداد دیکھ کر حیرت و عبرت ہوئی، تاہم مقالات مجموعی حیثیت سے اچھے اور مولانا کے شایان شان تھے مولانا دریابادی کی اس قدر دانی پر اتر پردیش اردو اکادمی کے نوجوان اور فعال چیرمین ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ستائش کے مستحق ہیں۔

مقالات

ماضی اور حال کی عربی نثر نگاری کا ایک تنقیدی جائزہ

از

پروفیسر محمد راشد ندوی صدر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ زبانوں کے بڑھنے اور پھیلنے میں سیاسی، سماجی اور مذہبی عناصر و محرکات کا بڑا دخل ہوتا ہے، اور یہ حقیقت بھی ہے، لیکن اس میں ایک عنصر کا اضافہ اور ضروری ہے، اور یہ عنصر خود اس زبان کا مزاج اور اس کی بناوٹ ہے، کیونکہ زبان کا مزاج اور اس کی بناوٹ اگر کمزور بنیادوں پر قائم ہو تو زمانے کے لحاظ سے جب یہ زبان ترقی کرے گی اور دنیا کے مختلف علاقوں میں جانے کے بعد وہاں کی مقامی زبانوں سے خلط ملط ہونے، وہاں کے تہذیبی اور ثقافتی ورثہ سے مالا مال ہونے کے ... کچھ عرصہ کے بعد اس زبان کا ربط ماضی سے کبھی ہلکا ہوتا ہوا اور کبھی ختم ہوتا ہوا نظر آتا ہے، بلکہ ایک زبان کچھ عرصے کے بعد مختلف زبانوں میں بٹ جاتی ہے، یا ایک زبان سے مختلف زبانیں وجود میں آجاتی ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کی زیادہ تر زبانوں کا کوئی تعلق ماضی بعید سے نہیں رہا، اور اسی لیے ان کے یہاں "دو" زبانوں کا تصور رہا ہے، ایک قدیم یعنی Classical زبان اور ایک جدید یعنی Modern زبان۔

عربی زبان کی بنیادی خصوصیات کا تسلسل

لیکن جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے، دو ہزار برس سے اس کی بنیادوں اور اصلیت میں کوئی فرق نہیں آیا، اسلام سے پہلے یہ زبان جزیرۂ عرب تک محدود تھی، اور یہ جزیرہ پھیلے ہوئے ریگستانوں کا ایک سلسلہ تھا، دور دور تک اس میں آبادی کا نام ونشان نہ تھا، کہیں کہیں ریتیلے اور کہیں کہیں ہرے بھرے پہاڑوں سے یہ جزیرہ مرکب تھا، اس کے پڑوسی ملکوں میں تہذیب وتمدن اور دولت کی فراوانی تھی، لیکن صحرا میں بسنے والے لوگ افلاس وسادگی کی زندگی بسر کر رہے تھے، ان کے خیموں کے گھر ریگستانوں میں ہوتے تھے جو موسم کے لحاظ سے منتقل ہوتے رہتے" اس علاقہ کو اس کے افلاس کی وجہ سے طاقت ور ممالک نظر انداز کیے ہوئے تھے، اس لیے یہ علاقہ بڑی حد تک ترقی یافتہ دنیا سے الگ تھلگ تھا، اس علیحدگی سے جزیرہ کو بعض حیثیتوں اور معاشی اعتبار سے نقصان تو ضرور پہونچا، لیکن دوسری طرف اس کا جو خاص مزاج اور بنیادی خصوصیت تھی وہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی، اور اس کی زبان اپنے علاقہ کی سرگرمیوں کو سموئے ہوئے وہاں کے مزاج وخصوصیت کو قبول کرتے ہوئے امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ہر اعتبار سے مضبوط اور مستحکم ہوتی گئی، چنانچہ اسلام سے پہلے کی زبان جو کچھ محفوظ ہے اور جسے ہم جاہلی شاعری کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زبان صدیوں سے ترقی کرتے کرتے اس معیار تک پہونچی، اور اتنی مضبوط ہے کہ آج تک مختلف مراحل سے گذرنے کے بعد بھی اسی دور کی زبان کو معیار تصور کرتی ہے۔

عام طور سے عربی ادب کے مورخین کا خیال ہے کہ اسلام سے پہلے عربی زبان کا سارا ذخیرہ شاعری تک محدود رہا، اور اس زمانے کی نثر قابل اعتنا نہیں ہے، اور جو نمونے اس دور کے پیش کیے گئے ہیں وہ یا تو قبائل کے شیوخ کے خطبے ہیں یا عبادت گاہوں

میں رہنے والے کاہنوں کی دعائیں اور اوراد ہیں، اور یہ دونوں نمونے ایک ترقی یافتہ زبان کے لیے کبھی بھی قابل اعتنا نہیں ہو سکتے، لیکن میری حقیر رائے میں عربی ادب کے مورخین نے چاہے وہ عرب ہوں یا مستشرقین دونوں نے اس دور کے سمجھنے میں عجلت سے کام لیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے سامنے صحیح حقائق نہیں آسکے، دنیا میں جب بھی شاعری ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہے تو اس کی مدد کے لیے نثری سرمایہ ضروری ہوتا ہے، کیونکہ اس کے ذخیرہ سے وہ الفاظ، تشبیہات، تمثیلات اور کنائے منتخب کرتی ہے، اور شاعری کو حسین اور موثر بناتی ہے، جب اس علاقہ کے بسنے والے عربوں نے صدیوں دنیا سے الگ تھلگ رہ کر اپنی زبان پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی کوشش کی اور غیر ملکی اثرات یہاں نہیں پڑنے دیے، اور صدیوں کی جدوجہد کے بعد اس زبان کا ذخیرہ اتنا وسیع ہوا کہ اسلام آنے کے بعد جب عرب دو صدی گذرنے کے پہلے پہلے دنیا کے اکثر وبیشتر ملکوں میں پھیل گئے تو فتوحات کے ساتھ ساتھ یہ زبان بھی جزیرۂ عرب سے نکل کر عرب فاتحین کا ساتھ دیتی رہی اور وہ جس علاقہ میں پہونچے یہ زبان مقامی زبانوں پر اثر انداز ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ عوام اور خواص کی زبان بنتی گئی، چنانچہ جاہلی دور کے نثری سرمایہ کی عظمت کا اندازہ ہمیں اس سے بھی ہوتا ہے کہ.... اللہ نے ایک رسول کو اس علاقہ میں مبعوث فرمایا اور اس پر آخری کتاب نازل کی جس کا ہر لفظ اپنی جگہ پر معجزہ ہے، کیونکہ اس کا ہر ہر لفظ خدا کی طرف سے ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آئے گی کہ اگرچہ قرآن کا ہر لفظ خدا کی طرف سے ہے لیکن اس میں جو الفاظ ہیں، تراکیب اور محاورے ہیں، تشبیہات اور کنائے ہیں وہ اس زبان میں پہلے سے موجود تھے، اور عرب اس سے آشنا تھے، اسی لیے انھوں نے اس کے اعجاز کو سمجھا اور اس کی فصاحت وبلاغت کے سامنے گر پڑے، مثلاً آیت ذیل:

اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے،
مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا	اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک
مِصْبَاحٌ ، اَلْمِصْبَاحُ فِيْ	طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ
زُجَاجَةٍ ، اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا	ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ
كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ	ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارہ،
شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ	اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے
لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ	مبارک درخت کے تیل سے روشن
يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَ	کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی جس کا
لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ	تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے
نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ، يَهْدِى	اس کو آگ نہ لگے، روشنی پر روشنی، اللہ
اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۔	اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے،
(النور : ۳۵)	رہنمائی فرماتا ہے۔

یا دوسری آیت:

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ	یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک
يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ	گہرے سمندر میں اندھیرا کہ اوپر ایک موج
مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ	چھائی ہوئی ہو، اس پر ایک اور موج اور
ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ	اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط
اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا	ہے، آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی
وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا	نہ دیکھنے پائے، جسے اللہ نور نہ بخشے

فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (النور ۴۰)	اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد جو کچھ بھی لوگوں سے فرمایا وہ آج تک محفوظ ہے، احادیث رسولؐ کا مجموعہ جو ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے، سارا کا سارا زبان و بیان کے لحاظ سے اپنی نوعیت میں بالکل منفرد ہے، اور روزمرہ کی بول چال کی زبان میں ہے، جو آج تک اسی چمک دمک کے ساتھ نظر آتی ہے، یقیناً احادیث کا یہ ذخیرہ زبان کے لحاظ سے اسی زبان کا تسلسل ہے جو اسلام سے قبل اس جزیرہ میں بولی اور سمجھی جاتی تھی، احادیث کے مجموعہ میں صحابہ کرامؓ کے بھی بہت سے اقوال موجود ہیں، جن سے ہماری بات کی تائید ہوتی ہے، مثال کے طور پر حضرت ابی ابن کعبؓ کی زبان جو جنگ تبوک میں شرکت نہ کر سکنے کی وجہ سے معتوب ہو گئے تھے، اور لوگوں نے ان سے بولنا چھوڑ دیا تھا، حضرت ابی ابن کعبؓ کے پاس دنیا کی ہر دولت اور آسائش کا ہر سامان موجود تھا، لیکن مدینہ ان کے لیے قیدخانہ سے بدتر ہو گیا، اس مدت میں جب وہ معتوب رہے، اپنی کیفیت کو انھوں نے جس طرح بیان کیا ہے آج کی عربی نثر جو ترقی کی راہ پر گامزن ہے، اس کو اگر کہیں سے بھی شامل کر دیا جائے تو قطعی یہ پتہ نہیں چلے گا کہ وہ جدید زبان سے کہیں بھی الگ ہے، اسی طرح حضرت عائشہؓ کے کلام کا وہ حصہ جس کو انھوں نے اس وقت بیان کیا جب منافقین نے ان پر الزامات لگائے تھے، ان کے کلام کا یہ مجموعہ حدیث الإفك کے نام سے احادیث کی کتابوں میں مذکور ہے، ہم اس کلام کو پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک سنجیدہ اور صاف ستھری نثر میں اندرونی کیفیت کو زبان مل گئی ہے، جس کے ہر ہر لفظ سے ایک پاک دامن خاتون کے جذبات متحرک ہیں، اور بیکسی کے عالم میں اس کی زبان تو بند ہے لیکن اس کے دکھے دل سے ایک عفت مآب زبان اپیل رہی ہے۔

جاہلی دور کے فوراً بعد ہی کے نثری سرمایے میں حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے کلام کا وہ مجموعہ دیکھیے، جو نہج البلاغۃ کے نام سے مشہور ہے اور جس کے بارے میں زبان و ادب کے ماہرین کا کہنا ہے کہ قرآن و حدیث کے بعد فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے عربی زبان کے ذخیرہ میں اس سے زیادہ فصیح و بلیغ کوئی مجموعہ نہیں، حضرت علیؓ نے کون سی زبان استعمال کی؟ وہی عربی زبان جو جاہلی دور میں بولی اور سمجھی جاتی تھی، یقیناً حضرت علیؓ نے اپنے علم و وجدان، اپنے جوش اور اپنی فنی مہارت کی وجہ سے اس زبان کو زمین سے آسمان تک پہونچایا، لیکن میرا اشارہ جس نکتہ کی طرف ہے وہ یہ کہ نہج البلاغۃ کی تراکیب، اس کے الفاظ اس کی تشبیہات اور کنائے وہی تو ہیں جو عام طور سے جاہلی دور میں لوگ بولتے تھے،

یہ بھی عجیب و غریب واقعہ ہے کہ عام طور سے شہروں اور قصبات میں رہنے والے لوگوں کی زبان گاؤں میں بسنے والے لوگوں سے بڑی حد تک بہتر اور شائستہ ہوتی ہے، لیکن عرب کے بادیہ نشینوں کا معاملہ بالکل مختلف تھا، بادیہ میں رہنے والے لوگوں کی زبان فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے شہروں سے بہتر ہوتی تھی، چنانچہ اس کی تائید رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے ہوتی ہے:

أدّبني ربّي فاحسن تأديبي — میرے رب نے مجھے زندگی میں اچھے
و رُبّيتُ في بني سعد — طریقے سے رہنے کا طور طریقہ سکھایا،
اور میری پرورش قبیلہ بنو سعد میں ہوئی

...

یعنی زبان کے لحاظ سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر لحاظ سے ممتاز تھے، قبیلہ بنو سعد وہی قبیلہ تو ہے جہاں کی حلیمہ سعدیہ تھیں، اور جو آپ کی رضاعی ماں تھیں، اور جن کی آغوش میں آپ نے پرورش پائی تھی۔

اس طرح ہم یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام سے پہلے عربی نثر کا جو سرمایہ موجود تھا وہی عربی زبان کے لیے آیندہ کی بنیاد قرار پایا۔

زمانے کے لحاظ سے اس میں نئے نئے نظریات اور نئے نئے افکار و رجحانات آتے گئے، لیکن زبان کی مرکزیت اپنے طور پر ہر زمانہ میں قائم رہی، اشاعت اسلام کے بعد اس زبان کی ترقی کی راہیں کھلیں اور صحرا سے نکل کر شام و عراق کے چمنستانوں، پھر وادئ نیل سے گذرتی ہوئی شمالی افریقہ کے پہاڑوں اور وادیوں میں منزلیں طے کرتی ہوئی اندلس کے لالہ زار میں پہونچی، اور جہاں سے بھی گذری وہاں کے رنگ و بو اپنے اندر سموتی رہی اور اپنے دامن کو ہر اعتبار سے مالا مال کرتی رہی اور اپنی عظمت و شوکت کو لوگوں کے دلوں پر ثبت کرتی رہی، اور دوسری صدی ہجری تک اندلس سے لے کر بحر ہند کے ساحل تک عوام کی زبان بن گئی، اس کے بعد جب اس زبان میں نئے نئے افکار و رجحانات آئے جن کی وجہ سے اس کو نئے رنگ اور نئی شان کے ساتھ منظر عام پر آنے کا موقع ملا۔ ذیل میں ہم نثر کے اسی سرمائے کا جو اسلام کے بعد سے آٹھویں صدی ہجری تک وجود میں آیا اجمالی جائزہ لیں گے

اموی و عباسی دور کی نثر | خلافت راشدہ کے بعد جب بنو امیہ کی حکومت قائم ہوئی تو حکومت کے ظاہری ڈھانچہ میں بنیادی تبدیلی ہونی شروع ہوئی، مرکز اور صوبوں میں مختلف شعبے اور محکمے وجود میں آئے، ان کی تنظیم رومی اور ایرانی محکموں کی بنیاد پر قائم ہوئی، بنو امیہ کے زمانے میں خلیفہ سے لے کر حکومت کے اہم عہدوں تک عربی النسل لوگ ہی فائز تھے، ان عہدوں کو حکومت کی جانب سے کچھ ایسی مراعات حاصل تھی جس کا احساس غیر عرب مسلموں کو شدت سے تھا، ان لوگوں نے حکومت اور مذہب کی زبان تصور کر کے عربی زبان کو حاصل کیا تھا، اس میں انھوں نے جس فراخ دلی کا ثبوت دیا وہ قابل تعجب ہے، بلکہ عربی زبان میں مہارت

حاصل کر کے وہ عربی النسل لوگوں سے سبقت لے جانے کی کوشش میں لگ گئے۔

عربی رسائل | ان غیر عرب مسلمانوں (موالی) کو حکومت کے معاملات میں دخیل تو نہیں
کیا گیا لیکن وہ علمی و ادبی سرگرمیوں میں نمایاں طور سے نظر آتے ہیں، ان ہی کے قلم سے
ادب کی ایک صنف وجود میں آئی جو رسائل کے نام سے متعارف ہوئی، یہ رسائل
درحقیقت سرکاری خطوط یا سرکلرس ہیں جو بنو امیہ کے زمانے میں حکومت کے دائرہ کار
کے وسیع ہونے کی وجہ سے خلفاء کو غیر عربوں سے انتظامی معاملات میں مدد لینے کی ضرورت
کے تحت لکھے جاتے جن میں غیر اسلامی ملکوں سے سیاسی اور اقتصادی روابط، صلح و
جنگ کے معاہدے، دستاویزات تیار کرنی ہوتیں، یہ ایسے معاملات ہیں جن میں بنو امیہ
کے خلفاء کو موالیوں کی مدد کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا، چنانچہ سب سے پہلے ہشام
ابن عبدالملک نے اپنے غلام سالم کو اپنے سکریٹریٹ میں رکھا، جو اپنی غیر معمولی علمی
وادبی صلاحیت کی بدولت کاتب کے عہدے پر فائز ہو گیا، سالم یونانی نسل کا تھا
اس لیے اسے یونانی زبان پر پورا عبور حاصل تھا، عربی زبان کو اس نے اپنی محنت اور
شوق سے حاصل کیا تھا، دونوں زبانوں سے غیر معمولی واقفیت کی وجہ سے اسے
امور مملکت سے پوری واقفیت حاصل تھی اس لیے وہ ترقی کرتے کرتے الکاتب
کے عہدے پر فائز ہو گیا، الکاتب کی حیثیت وزیر یا سکریٹری جنرل کی ہوتی تھی، جو خلیفہ
سے گفتگو کے بعد حکومت کی پالیسی طے کرتا اور اس پالیسی کو اپنے انداز میں مرتب کر کے
صوبوں کے گورنروں اور دوسرے اہم عہدیداروں کو روانہ کرتا، اس طرح ایک طرف
تو وہ حکومت سے قریب ہوتا گیا اور دوسری طرف عوام کا وہ اونچا طبقہ جو حکومت سے
قریب تھا اس کے ذہن پر اثر انداز ہونے لگا، سالم نے حکومت کی یہ ذمہ داری بڑی

مہارت سے انجام دی اور اس سے عجیب وغریب بات یہ ہے کہ اس نے اپنی نگرانی میں ایک
دوسرے غیر عرب نوجوان کو اس عہدے کے لیے تیار کیا جو عبدالحمید الکاتب کے نام سے
مشہور ہے۔

عبدالحمید ایرانی نسل کا تھا، اور ابتداء میں مکتبوں میں چھوٹے بچوں کا معلم تھا پھر
وہ ہشام ابن عبدالملک کے زمانے میں دیوان الرسائل کے محکمہ سے وابستہ ہوا، اسی زمانے
میں سالم نے اس پر خاص توجہ دی اور اس کو رسائل کے لکھنے اور مرتب کرنے کی تربیت دی،
عبدالحمید غیر معمولی ذہین تھا، انتظامی امور کے ساتھ ساتھ عربی زبان پر اس کو اتنی مہارت
حاصل ہو گئی کہ بنو امیہ کے زمانے میں فصاحت وبلاغت کا امام تصور کیا جانے لگا، اور
اس کی تحریروں کی نقل اس زمانے کے نوجوان کرنے لگے، عبدالحمید الکاتب کو عربی زبان
پر مہارت اور قدرت کے ساتھ ساتھ امور مملکت اور اس میں جن علوم کی ضرورت ہوتی
ہے، ان پر بھی پوری قدرت حاصل تھی، چنانچہ اس کا وہ خط جو اس نے مملکت کے مختلف
محکموں کے ذمہ داروں کے نام بھیجا تھا، جس میں اس نے یہ تاکید کی تھی کہ حکومت سے
وابستہ ہر فرد کو کن کن علوم کی ضرورت ہوتی ہے، اور ان میں مہارت حاصل کیے بغیر انھیں
انتظامیہ سے قریب نہیں ہونا چاہیے، اس خط سے اس کے رچے ہوئے ذہن اور
جولانی قلم کا اندازہ ہوتا ہے، عبدالحمید الکاتب مروان بن محمد کے زمانے میں حکومت
کے معاملات میں پوری طرح دخیل تھا، اور خود آخری خلیفہ کو اس پر پورا اعتماد اور بھروسہ تھا
اور وہ خلیفہ ہی کے ساتھ عباسیوں کے انقلاب کے بعد مصر میں بوصیر میں مارا گیا۔

عبدالحمید الکاتب اگرچہ بنو امیہ کے آخری خلیفہ کا دست راست اور ادیب و
انشاپرداز تھا، لیکن اس نے زبان وبیان کی ایسی چھاپ چھوڑی کہ جب عباسی حکومت

قائم ہوئی اور ان کے یہاں بھی دیوان الرسائل کا محکمہ قائم ہوا تو ان کے کاتبوں نے بھی عبدالحمید ہی کے اسلوب کو اپنایا، جو خلفاء اور ذمہ داروں کو اتنا بھایا کہ انھوں نے اس کی ہر طرح سے ترویج و ترقی کی۔ اور کوئی اچھا کاتب اس وقت تک تصور ہی نہ کیا جا سکتا تھا، جب تک کہ وہ اپنے قلم کے جوہر اس انداز سے نہ دکھاتا جس انداز سے عبدالحمید الکاتب نے دکھائے تھے، چنانچہ عباسی دور میں ابن العمید، ابن عماد، صابی، خوارزمی، قاضی الفاضل عماد الدین اصفہانی یہ وہ ادباء و فنکار ہیں جو اپنے اپنے زمانے میں حکومت کے اہم عہدوں سے وابستہ رہے، اور خلفاء و سلاطین کے مقرب رہے، عبدالحمید الکاتب کے انداز و اسلوب میں فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھائے گئے ہیں، لیکن وہ درحقیقت غیر فطری اور غیر قابل قبول تھا کیونکہ اس میں شروع میں فکر کی بلندی کے ساتھ ساتھ زبان کی بلندی تو ضرور تھی، لیکن بعد میں آہستہ آہستہ فکر و علم کا عنصر کم ہوتا گیا، اور تصنع و تکلف اس کی جگہ لینے لگا، لیکن اس کے باوجود ایک مخصوص حلقہ میں وہ پسندیدہ تھا، جس کا اثر یہ ہوا کہ عباسی دور میں کچھ ایسے ادبا پیدا ہوئے جو حکومت سے تو وابستہ نہیں تھے لیکن ان کی نظر عوام سے زیادہ خلفاء اور حکومت کے عہدیداروں پر تھی، جنھوں نے ان کو خوش کرنے کے لیے ایسے اسلوب کی ترویج کی اور تصنیفی کام بھی اسی زبان میں شروع کیا جو صرف تفریح کے لیے لکھا گیا تھا جس میں کوئی تعمیری مقصد نظر نہیں آتا، اس طرز بیان کے دو امام پیدا ہوئے، ایک بدیع الزمان ہمدانی اور دوسرے الحریری، چنانچہ عبدالحمید الکاتب سے لے کر ہمدانی اور حریری کا انداز جو آج بظاہر شعبدہ بازی پر مبنی نظر آتا ہے عہد عباسی کی زبان و بیان کا اعلیٰ نمونہ تصور کیا جاتا تھا، اور خلفاء کے دربار میں اسی طرز تعبیر کا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔

عام فہم طرز تعبیر

زبان و بیان کا ایک دھارا تو یہ تھا، لیکن اس کے مقابلے دوسرا دھارا جو اس کے بالکل برعکس اور متضاد ہے وہ ہے عوامی اور عام فہم طرز تعبیر، یہ طرز تعبیر فنی طور پر اموی دور میں نظر نہیں آتا، بلکہ اس کی بنیاد عباسی دور میں پڑی جس کا موجد ابن المقفع ہے جو ایرانی نسل کا تھا، اور فارسی و ایرانی زبان میں اسے غیر معمولی قدرت حاصل تھی، اس نے عربی زبان کو اپنے ذوق و شوق سے حاصل کیا تھا، ابن المقفع کے اور تخلیقی کام کے مقابلے میں نقل و ترجمہ میں اس کا کام زیادہ ہے، اس نے یونانی زبان سے تاریخ اور فلسفہ کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا، چنانچہ ارسطو کے بہت سے رسائل کا وہ عربی میں پہلا مترجم شمار کیا جاتا ہے، اسی طرح اس نے قدیم ایرانیوں کے عقائد سے متعلق "المزدک" کا بھی عربی میں ترجمہ کیا، اس کا سب سے اہم ترجمہ کلیلہ و دمنہ ہے، اس نے اس کتاب میں صحیح ترجمہ کا نمونہ ہی نہیں پیش کیا بلکہ عربی نثر کا ایک ایسا سلیس اور عام فہم نمونہ پیش کیا جو امتداد زمانہ کے باوجود نیا اور نرالا نظر آتا ہے، کلیلہ و دمنہ عربی نثر کا پہلا مجموعہ ہے، اور یہ توقع کی جاتی تھی کہ بعد کے آنے والے ادباء اور اہل قلم اسی کو اپناتے اور آگے بڑھاتے رہیں گے ابن المقفع کے اور تخلیقی کاموں میں الادب الکبیر اور الادب الصغیر ہے، یہ کتاب اگرچہ عربی زبان میں مرتب کی گئی ہے، لیکن اس میں [illegible] زندگی بسر کرنے کے جو اصول بیان کیے گئے ہیں وہ اس زمانہ کی ترقی یافتہ اقوام کے آداب و اصول ہیں، بہر صورت یہ دونوں کتابیں عربی نثر نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ابن المقفع کے بعد علمی و ادبی میدان میں جاحظ کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے، جو اپنی غیر معمولی معلومات، ذہانت اور زبان پر قدرت و مہارت کی بدولت عربی ادب میں نثر نگاری کا امام تصور کیا جاتا ہے، جس کی بدولت عربی نثر تیسری صدی ہجری تک علمی

ذخیروں کا مرکز بن گئی، چنانچہ اس کی کتابیں البیان والتبیین، کتاب الحیوان، کتاب البخلاء اور اس کے متعدد اہم رسائل فنی اور فکری لحاظ سے آسمانی صحیفوں کی عظمت تک پہونچ گئے، جاحظ کے اسلوب کی جھلک ہم بعد میں آنے والے ادیب ابو حیان توحیدی کی کتابوں میں دیکھتے ہیں، خاص طور سے اس کی کتاب "الامتاع والمؤانسة" زبان و بیان کے لحاظ سے جاحظ کی اہم تصانیف کے مرتبہ تک پہونچ جاتی ہے۔

عربی نثر میں دوسرے علوم کی تصنیفات

جاحظ اور ابو حیان توحیدی کے اسلوب کو بعد کے آنے والے تمام مصنفین نے اپنایا جن کا مقصد عوام اور علم کی خدمت تھا، زمانہ و اشخاص کے اعتبار سے اس اسلوب میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہا، لیکن سادگی اور سلاست کے دامن کو کسی مصنف نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا، تیسری صدی کے بعد تاریخ، جغرافیہ، تفسیر، فقہ، علم کلام، تصوف، فلسفہ و طب پر ترجمہ یا تصنیف کے ذریعہ اسلامی مملکت کے پھیلے ہوئے رقبہ میں تصانیف کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، اور ہر کتاب اپنی جگہ پر موضوع اور زبان کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے، اس طرح عربی زبان کی جڑیں اتنی مضبوط اور مستحکم نظر آتی ہیں کہ جن کو دیکھ کر تاریخ ادب کا طالب علم حیران و ششدر رہ جاتا ہے، اندلس میں ابن عبد ربہ ابو علی القالی جو عربی لغت و ادب کے محقق ادیب ہیں، جن کی عقد الفرید اور الامالی ہر محقق و ادیب کی قدم قدم پر رہنمائی کرتی ہیں، اسی طرح تاریخ و فلسفہ اور علوم اسلامیہ میں ابن رشد، ابن حزم، لسان الدین الخطیب اور ابن عبد البر جیسی مایۂ ناز شخصیتیں پیدا ہوئیں، ان مصنفین نے عربی زبان و فلسفہ، طب، تاریخ و فقہ جیسے موضوعات کے لیے سہل اور معتدل اسلوب ایجاد کیا، جو ہر زمانے میں قابل قبول رہا، اس طرح مشرق میں قاہرہ، دمشق، بغداد، موصل، حلب پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو تیسری صدی سے لے کر آٹھویں صدی ہجری

تک ہر موضوع پر لکھنے والی شخصیات آفتاب و ماہتاب کی طرح چمکتی اور متحرک نظر آتی ہیں جن کی علمی و تحقیقی کاوشوں سے عربی نثر عروج کی اعلیٰ منزلوں تک پہونچ گئی، اس سلسلہ میں ابو الفرج اصفہانی کی تصنیف الآغانی، ابن قتیبہ کی الامامة والسیاسة اور نقد الشعر، عبد القاہر جرجانی کی دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغة، ابو ہلال العسکری کی کتاب الصناعتین، ابن خطیب بغدادی کی خزانة الادب، امام شافعی کی کتاب الأم، امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج، امام غزالیؒ کی الاحیاء اور المنقذ من الضلال، ابن سینا کی کتاب المبدأ والمعاد، مسکویہ کی کتاب تہذیب الاخلاق، ابن خلکان کی وفیات الاعیان، الماوردی کی الاحکام السلطانیہ، ابن جوزی کی صید الخاطر، اور تلبیس ابلیس، ابن تیمیہؒ کی منہاج السنة اور ابن القیم کی زاد المعاد، صلاح الدین ایوبی کے دست راست ابن شداد کی سیرة صلاح الدین الایوبی، اور بعد کے مفکرین میں ابن خلدون کا المقدمہ وغیرہ، تمام تصانیف میں جہاں موضوع کی رنگا رنگی ہے وہیں نثر کا اتنا حسین اور دلکش انداز ہے کہ زمانہ اور حالات کی تبدیلیوں کے باوجود وہ زندہ اور موثر ہے، ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ عربی زبان و بیان کا تیز گام قافلہ آٹھویں صدی ہجری کے بعد تقلید اور جمود کی بیڑیوں میں جکڑ جائے گا، اور حسین و دلکش طرز بیان کی جگہ ایسا بے جان اور بے کیف انداز بیان وجود میں آئے گا جس میں نہ کوئی رنگ ہوگا اور نہ بو۔

آٹھویں صدی ہجری کے بعد کا دور

آٹھویں صدی ہجری کے بعد اسلامی ملکوں میں اتحاد و استحکام کے بجائے انتشار و خلفشار، عدل کے بجائے ظلم، ہمت و حوصلے کے بجائے توکل و استسلام، اجتہاد کے بجائے تقلید کی فضا پیدا ہوئی تو علمی و ادبی مرکزوں کی بساط ہی الٹ گئی، تعلیم و تربیت کے صحیح مقاصد راہ سے ہٹ گئے، سقوط اندلس کے بعد سے

مسلم سوسائٹی میں مایوسی کی جو فضا ابھری وہ ختم نہ ہو پائی، اس طرح دیہاتوں اور قصبوں سے علم وادب کے مراکز اٹھ کر بڑے بڑے شہروں میں منتقل ہو گئے، اور خود بڑے شہروں میں خانہ جنگی کی وجہ سے علماء اور اہل قلم میں خوف وہراس پیدا ہوا، جس کی وجہ سے مدارس وجامعات اپنے اپنے حال پر مرثیہ خواں تھے، عربی زبان کا یہ عجیب وغریب المیہ ہے کہ دور انحطاط اور انتشار کے زمانے میں جب اور تخیل کا کام موقوف ہو گیا تو لوگوں نے اپنے اسلاف کے کارناموں اور تذکروں کی تدوین وترتیب کا کام شروع کیا، گو یہ کام بھی اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے، لیکن علمی کارناموں اور تذکروں میں جو زبان اختیار کی گئی وہ عبد الحمید، ابن العمید اور قاضی الفاضل کی زبان تھی، جس میں تصنع، تکلف اور پیچیدگی کے علاوہ کچھ نہیں تھا، ان ادیبوں کو کم از کم زبان وبیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی، اس لیے ان کے رسائل کو پڑھتے وقت ان کے قلم کی مہارت پر داد تو یقیناً ملتی تھی لیکن جب بعد کے لوگوں نے ان کے اسلوب وطرز بیان کو اپنایا تو نہ ان کو زبان پر قدرت حاصل تھی اور نہ ان کا علمی ذوق پختہ تھا، اس لیے ان کا اسلوب چیستاں بن کر رہ گیا اور یہ اسلوب تاریخ، تذکرہ، تفسیر، فقہ، فلسفہ، منطق، نقد وبلاغت جیسے اہم اور دقیق موضوعات پر حاوی ہو گیا، اور بدقسمتی سے اس دور کی مرتبہ کتابیں اسلامی مملکت کے پھیلے ہوئے علاقوں میں مدارس وجامعات کے نصاب میں داخل کی گئیں، اور ابتدائی صدیوں میں ان موضوعات پر لکھی ہوئی کتابوں سے نہ شاگرد واقف تھے اور نہ استاذ، علم وادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے بجائے لفظی پیچیدگیوں میں طلبہ کو الجھانا استاذ کی مہارت اور لیاقت تصور کیا جاتا تھا، اور سب سے کامیاب زبان اور انداز بیان وہ تصور کیا جاتا جس میں مبتدا اور خبر کی تقدیم وتاخیر، حال اور ذوالحال کے حذف کا اہتمام کیا جاتا اور پڑھنے والا اصل مسئلہ

کے بجائے مبتدا اور خبر، حال اور ذوالحال کی تلاش میں کھو جائے، زبان وبیان، تالیف و تصنیف کا یہ سلسلہ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک جاری رہا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے بعد عرب ممالک میں کچھ ایسے حالات پیدا ہونے شروع ہوئے جن کی وجہ سے ذہنوں کا جمود آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا، اور سوتی ہوئی قوم میں بیداری کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے، اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ جن حالات سے پوری قوم دوچار ہے اب وہ دیر تک باقی نہیں رہیں گے، سب سے پہلے جس چیز نے پوری عرب قوم کو جھنجھوڑا وہ ہے سنہ ۱۷۹۸ء کا واقعہ، جب سب سے پہلے مصر میں نپولین کی قیادت میں فرانسیسی فوجیں داخل ہوئیں اور دیکھتے دیکھتے پورے مصر پر اپنا تسلط جما لیا، یہ وہ زمانہ تھا جب مصر میں کوئی منظم حکومت نہیں تھی، اور وہ مختلف حصوں میں بٹا ہوا تھا، جن پر مملوکوں کی حکومت تھی، جن کا کام صرف یہ تھا کہ سالانہ معینہ رقم دولت عثمانیہ کے خزانے تک پہونچا دیں، اور اس کے بعد اپنے آرام وتفریح کی خاطر مال ودولت جمع کرنے کے جو بھی طریقے اختیار کریں وہ سب ان کے لیے روا تھا، خاص طور سے مصر کا کسان سب سے زیادہ بے بسی کی زندگی گذار رہا تھا، چھوٹے اور بڑے شہروں میں تجار بھی خائف و ہراساں تھے، اور پوری سوسائٹی کرب وبے چینی کے دور سے گذر رہی تھی، ایسے حالات میں پہلی مرتبہ صدیوں کے بعد یعنی صلیبی حملوں کے بعد یہ دوسرا واقعہ ہے جب غیر ملکیوں نے جن کا مذہب، زبان اور کلچر یہاں کے لوگوں سے بالکل مختلف تھا، یہاں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی، مگر در اصل ان دونوں حملوں میں بڑا فرق تھا، کیونکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو جب صلیبیوں نے اس علاقے پر حملہ کیا اور ان کی فوجوں نے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کرتے ہوئے بیت المقدس تک پر قبضہ کر لیا تو اس وقت عرب ملکوں کی حالت یوروپ کے تمام

ملکوں سے بہتر تھی، ان کی فوجی طاقت، حکومت کی آمدنی، نیز تعلیمی و تہذیبی حالت یورپ سے ہر لحاظ سے بہتر تھی، صرف اسلامی ملکوں کی آپس کی نااتفاقی کی وجہ سے صلیبیوں کو کامیابی حاصل ہوئی، لیکن صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں جب عربوں میں اتفاق و اتحاد پیدا ہوا تو انھوں نے اس تیزی سے صلیبیوں سے اسلامی ممالک کو پاک کیا جس تیزی سے وہ ان ملکوں میں آئے تھے۔

نپولین کے حملہ کے وقت اور اس کے بعد کے حالات

لیکن ۱۷۹۸ء کے حملے کے وقت یہاں کے حالات بالکل مختلف تھے، یورپ تین صدیوں سے ترقی کی راہ پر گامزن تھا، فوجی طاقت کے ساتھ ساتھ سائنس اور ادب میں بھی وہ ترقیوں کے مراحل طے کر رہے تھے جبکہ اسلامی ملکوں میں نہ سائنس کا تصور تھا اور نہ علم کا، ان کی فوجی طاقت یورپ کے مقابلے میں صفر تھی، اس لیے یورپ کا یہ حملہ صرف حملہ نہیں تھا، بلکہ اپنی طاقت سے مرعوب کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے علم، ادب، ثقافت، نظام حکومت اور عدل و انصاف کے تصور سے بھی عربوں کو محو حیرت کر دیا تھا، اس زمانے کے مورخ عبدالرحمٰن الجبرتی نے فرانسیسی فوجوں اور وہاں کے ماہرین تعلیم و سائنس کا جو نقشہ کھینچا ہے، ایسا لگتا ہے کہ کوئی جادوگر اپنے جادو سے پوری قوم کو مسحور کر رہا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ جب فرانسیسی علماء، فوجی افسران اور ان کی عورتیں سڑکوں پر نکلتے تو لوگ گلی اور کوچوں میں جمع ہو کر ان کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھتے، اس وقت کے حالات کے تحت یہ یقین پیدا ہو رہا تھا کہ اس سرزمین سے فرانسیسیوں کے قدم کبھی باہر نہیں نکلیں گے، اور اپنی تہذیب و تمدن اور ادب و ثقافت کی جڑیں اس علاقے میں اتنی مضبوط کر دیں گے کہ یہاں کے مذہب کے ساتھ زبان و ادب کا بھی خاتمہ ہو جائے گا، لیکن حالات اس کے بالکل برعکس پیدا ہوئے

اور صدیوں کے بعد مصر کے عوام میں اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا ہوئی، اور ایک زبان ہو کر انھوں نے یہ اعلان کیا کہ اپنے خون کے قطرے قطرے کو بہا دیں گے، لیکن غیر ملکی سامراج کو ایک لمحہ کے لیے اپنی مقدس سرزمین میں رہنے نہیں دیں گے، اتفاق و اتحاد کی اسی طاقت نے چار سال بھی فرانسیسیوں کو رہنے نہیں دیا، اور اٹھارویں صدی کے خاتمہ تک ان کے قدموں کو ہلا دیا، اور انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی ان کو ملک سے باہر جانے پر مجبور کر دیا، اس کے بعد کچھ عرصہ تک افراتفری کا دور رہا، لیکن ۱۸۰۵ء میں محمد علی جو دولت عثمانیہ کا کمانڈر تھا، مصر والی بنا کر بھیجا گیا، آہستہ آہستہ اس نے مصر میں تقریباً آزاد حکومت قائم کر لی، اور مصر کے لوگوں نے بھی اس کی حکومت کو تسلیم کیا، فرانسیسی حملہ سے مصر میں طوائف الملوکی کا دور ختم ہوا، اور دنیا کے جلووں نے مصریوں کو اپنی زندگی پر نظر ثانی کا احساس دلایا، جو درحقیقت قوموں کی ترقی پر گامزن ہونے کا پہلا زینہ ہے، چار سال میں فرانسیسیوں نے مصر پر گہرے اثرات چھوڑے، نظام حکومت میں اصلاحات کیں، سائنس و ادب کی اکیڈمیاں قائم کیں، بہت سے اسکول کھولے، کاغذ کے کئی کارخانے اور ملیں کھولیں، اخبارات اور کتابوں کو چھپنے کے لیے کئی مطبعے قائم کیے، اور کئی روزنامے فرانسیسی زبان میں جاری کیے، اگر کچھ عرصہ اور رہ جاتے تو مصر کی کایا پلٹ جاتی، لیکن اس کے باوجود انھوں نے جو نقوش چھوڑے وہ بڑے گہرے تھے، چنانچہ نئے والی محمد علی کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ جب تک مصر میں زبان و ادب، سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم نہیں ہو گی وہ صحیح معنی میں آزاد نہ ہو سکے گا اور دنیا کے نقشہ میں اس کا کوئی مقام نہ ہو گا، اس تصور کے تحت اس نے مصر کے ہونہار طلبہ کو فرانس اور انگلستان بھیجنا شروع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ یورپ کے ترقی یافتہ

ملکوں سے ڈاکٹر، انجینیر، ماہرین تعلیم اور سائنس دانوں کو بلاتا اور ان کی خدمات سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا، آہستہ آہستہ لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہونا شروع ہوا، اور وہ نوجوان جنھوں نے فرانس اور انگلستان میں تعلیم حاصل کی جب واپس آئے تو مغربی ملکوں کی تہذیب و تمدن، سائنس و فلسفہ سے اپنی قوم کو روشناس کرایا، اور مصر میں مغربی طرز کے اسکول، انسٹی ٹیوٹ اور تعلیمی مراکز قائم کرنے شروع کیے، چنانچہ مدرسۃ الالسن School of language، کلیۃ دار العلوم اور مدرسۃ القضاء جیسے اہم تعلیمی اور ثقافتی ادارے قائم ہوئے، اس کے ساتھ ساتھ میڈیکل اور انجینیرنگ کالج بھی قائم ہوئے، جن میں ابتداء میں غیر ملکی ماہرین اور اساتذہ تدریسی خدمات انجام دیتے اس طرح آہستہ آہستہ زندگی کی روشنی مختلف گوشوں سے نکلتی ہوئی نظر آنے لگی، لیکن سماجی اور سیاسی زندگی میں وہ تیزی اور ہماہمی نظر نہیں آتی جو ہونی چاہیے، ایسا لگتا ہے کہ عوام کو ذہنی طور پر اتنا پست کر دیا گیا تھا کہ ان کے اندر اپنے حقوق کے مطالبے کی جرأت ہی نہیں تھی، بلکہ یہ کہا جائے کہ انھیں اپنی غلامی اور ذلت کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا تو صحیح ہوگا، بدقسمتی سے محمد علی کے زمانہ اور اس کے بعد مصر میں جو علمی ترقی ہوئی وہ ایک خاص طبقہ تک محدود تھی، اور اس طبقہ کی ساری توجہ یہ تھی کہ حکومت کے مراکز و مناصب تک پہونچ جائے اور حکام کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھے، چنانچہ اس پورے عرصہ میں ہمیں ایسی کوئی تحریر نہیں ملتی جس میں عوام کے افلاس، جہالت اور ان پر ظلم و تشدد کا تذکرہ ہو، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصر میں ایک ساتھ دو سوسائٹیاں وجود میں آ رہی تھیں، ایک کی نمایندگی جرکسی نسل کے فوجی عہدیداران، بڑے بڑے افسران حکومت اور گاؤں و قصبات میں حکومت کی جانب سے اراضی یافتہ بڑے بڑے جاگیر دار، لیکن جہاں تک مصری عوام کا تعلق تھا وہ نئی تعلیم اور نئی تہذیب کے ثمرہ سے یکسر محروم تھے (باقی)

اقبال کا فلسفہ خودی

از

جناب محمد بدیع الزماں۔ ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پھلواری شریف۔ پٹنہ

اقبال کے فلسفہ کو عام طور پر "فلسفۂ خودی" کہا جاتا ہے۔ مگر یہ بے خودی سے بھی عبارت ہے۔ خودی کا عمرانی پہلو بھی ہے اور مابعد الطبیعاتی پہلو بھی ہے۔ اقبال کی اصطلاح میں انسانی خودی کائنات کے ارتقائی عمل کا نصب العین یا اس کی ایک منزل ہے جسے خط ارتقاء کا آخری نقطہ یا سفر ارتقاء کی منزل کہا جا سکتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے خودی ارتقاء کی منازل طے کرتی آرہی ہے اور انجام کار خاک آدم میں جلوہ گر ہوئی لیکن یہ خاک سے پیوند نہیں رکھتی۔ اسے نہ ہم ناپ تول سکتے ہیں اور نہ حواس خمسہ سے اسے محسوس ہی کر سکتے ہیں۔

خودی ایک رہنما قوت کی حیثیت سے انسانی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کرتی ہے۔ یہ اقبال کے وحدتی نظام فکر میں ایک ماورائی منزل بھی ہے اور کائنات کے ارتقاء کا جذبۂ محرک بھی۔ انسانی وجود کو یہ آرزو کا حوصلہ بخشتی اور اسے ان آرزوؤں کی تکمیل کے لیے آگے کی منزل کی جانب ارتقاء کے لیے اکساتی بھی ہے۔ اس کا نشیمن انسان کا دل ہے جسے اقبال نے بڑی دلکش تشبیہ سے سمجھایا ہے کہ جس طرح اتنا بڑا آسمان آنکھ کے چھوٹے سے تل سے نظر آجاتا ہے اسی طرح خودی، جو اس قدر غیر محدود طاقتوں کی مالک ہے، دل میں سما سکتی ہے۔ ظاہر کی آنکھ سے دیکھنا اقبال کو نہیں بھاتا۔ دیدۂ دل ہی ان کے لیے سب کچھ ہے۔ ان کے نزدیک شخصیت یا خودی کے مسلسل اظہار

ہی میں خود کائنات کا مفہوم پنہاں ہے۔ یہ ان کے نزدیک ایک نقطۂ نوری ہے جو نظام عالم کی بنیاد ہے جس کے بغیر عناصر ترکیب نہیں پاسکتے یا یوں کہا جائے کہ یہ تعلیمات اقبال کا سنگِ بنیاد ہے۔

خودی کو اگر فلسفہ کہا جائے تو یہ اثبات حیات کا فلسفہ ہے۔ مگر، اقبال کے یہاں یہ ان معنوں میں شاعرانہ یا فلسفیانہ قسم کا نظریہ نہیں جو کسی آئندہ زمانہ میں متغیر یا کمزور ہو سکے بلکہ یہ ایک ازلی و ابدی صداقت ہے۔ یہ دنیا کی وہ عظیم ترین نعمت ہے جس کے ذوق و شوق میں انبیاءؑ و صلحا، شہدا اور اولیا نے دنیا کی تمام دیگر اشیا کو در خور اعتنا نہ سمجھا۔ یہ خودی غنائے نفس کا وہ مقام ہے جہاں "قلب سلیم" کا نایاب تحفہ ملتا ہے۔ یہ وہ فطرت ہے جو ہمارے جنم دن سے ہمارے ساتھ آئی ہے اور تادم مرگ ہم سے باوفا رہتی ہے۔ یہی "فطرت الٰہی" یا "خودی" ہمارے سینے میں "من" "انا" یا "ہستم" کی صدائے سرمدی پیدا کرتی ہے اور اس صدا کی تعظیم و تعمیل فروغ روح اور عروج حیات انسانی کی اولین شرط ہے۔

اقبال کی خودی بے لگام خودی نہیں، شیطانی خودی نہیں، انکاری نہیں بلکہ اقراری ہے۔ ایک اچھوتے انداز کا اقرار۔ اس کی خود ستائی کا مقصد خدا آگاہی ہے۔ اس کے ذریعے اقبال انسان کو اس کی گہرائیوں تک اتارنا چاہتے ہیں۔ اس پر وہ اسے تمام تر خوبیوں، بلندیوں اور عظمتوں کو روشن کرتے ہیں تاکہ وہ خود کو پہچاننے کیساتھ خدا کو پہچان سکے۔ مَن عرفَ نفسہ، فقد عرفَ ربہ

اقبال انسان کو فطرت کا شاہکار سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک زندگی کا مقصد انسانیت کو مکمل کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صفت پر پیدا کیا ہے۔ اس پر اقبال بہت نازاں ہیں مگر نہیں انسان کی ہستی بہت اہم نظر آتی ہے حتیٰ کہ خدا کا تصور باندھتے ہوئے بھی وہ انسان کے خدوخال ہی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ خارجی دنیا میں ایک انقلاب عظیم دیکھنے کے متمنی ضرور تھے لیکن وہ خارجی انقلاب کے لیے داخلی انقلاب کو ایک ضروری شرط تصور کرتے تھے وہ سمجھتے

تھے کہ کائنات ان گنت موجودات کی ایک مجموعی اور منظم شکل کا نام ہے جس میں ہر شے ایک جداگانہ حیثیت، ماہیئت اور اہمیت کا مالک ہے اور یہی اس کی خودی ہے۔ خودی کا احساس یعنی خود شناسی، خود افزائی اور خود اعتمادی کی صفات سب سے زیادہ انسان میں موجود ہے۔ اس لیے کہ انسان ہی وہ باشعور مخلوق ہے جو بہ اعتبار خلقت اپنے خالق سے بہت قریب کا رشتہ رکھتا ہے اور یہ رشتہ ہے زندگی کا۔ اس زندگی کا جو ہمیشگی سے پیوستہ ہے، جو اوجھل تو ہوتی رہتی ہے مگر معدوم نہیں ہوتی۔ اقبال کے نزدیک انسانی خودی کی انتہا صرف انسانی خودی کی انتہا ہے کسی اور کی ابتدا یا انتہا نہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ اس احساس کا نام ہے کہ ہم اشرف المخلوقات ہوں۔ اسی احساس کو فروغ دینے کی انتھک کوشش زندگی کے استحکام اور پائندگی کی ضامن ہے اور جو فکر و عمل کے وسیع امکانات بھی پیدا کرتی ہے۔

خودی انسان کا مادی پہلو نہیں کیونکہ مادی پہلو تو اقبال کے لیے محض ایک عارضی اور ثانوی حیثیت رکھتا ہے گرچہ خودی ایک غیر مادی چیز ہوتے ہوئے مادی جسم ہی پر تصرف کرتی ہے۔ اقبال انسان کی حیوانی خودی کو نہیں بلکہ اس کی روحانی خودی کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ وہ جہد للبقا میں حیوانیت کو نہیں بلکہ روحانیت ہی کو اصل معیار زندگی سمجھتے ہیں۔ ان کا مثالی حاکم مرد قلندر ہے جو روحانی قدروں کے سامنے دنیا کی ہر چیز کو ٹھکرا دیتا ہے۔

اقبال ایک زندہ اور بہمہ وجوہ کامل سوسائٹی کے لیے مثالی افراد کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے جن میں خودی کی تکمیل ہو چکی ہو۔ انھوں نے اپنی شاعرانہ قوت کا بیشتر حصہ فرد کو اپنی شخصیت کی تکمیل پر آمادہ کرنے میں صرف کیا ہے۔ اور شخصیت ہی کی تکمیل کے لیے انھوں نے خودی کے اثبات و استحکام کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں مگر وہ صرف فرد کی ترقی اور تکمیل ہی کے قائل نہ تھے بلکہ ان کے نزدیک فرد کی ترقی اور تکمیل کا بنیادی مقصد یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تمام

تربیت یافتہ صلاحیتوں کو جماعت کے مقاصد میں لگا دے۔ ان کے فلسفہ میں جب کوئی فرد اپنی خودی کو جگا لیتا ہے تو اس کی نگاہ سے "بدل جاتی ہیں تقدیریں"۔ لیکن جب کسی سوسائٹی یا جماعت کی خودی جاگ جاتی ہے تو پھر اس کی قوتِ تسخیر، اس کی جاذبیت اور اس کے حرکت و عمل سے برسنے والی برکتوں کی وجہ سے یہ دنیا دارالمحن ہوتے ہوئے دارالسلام بن جاتی ہے۔

انسانی خودی اقبال کے یہاں زندگی کی سب سے اعلیٰ صورت یا انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اگر کائنات کو انسان فرض کر لیا جائے تو خودی کو اس کے شعور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کیونکہ انسان میں اگر شعور نہ ہو تو اس کا وجود و عدم دونوں برابر ہیں۔ انھوں نے جس خودی کو بیدار کیا وہ سروں کے جھکنے اور اٹھنے میں ایک خاص کیفیت پیدا کر کے انہیں ایک مخصوص شکل کا پابند بنا دیتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو خود آگاہ بندے کے لیے ہی مخصوص ہے۔ دنیا کی کوئی ہستی اس نعمت میں اس کی شریک نہیں۔ مگر جو شخص جھکتا ہے وہ بھی خود آگاہ نہیں۔ قیام کی جگہ قیام اور سجود کی جگہ سجود اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی اپنے مقام کو اچھی طرح پہچان لے۔ مختصر یہ کہ خود کو پہچانے بغیر آدمی خدا کو نہیں پہچان سکتا۔ اور خدا کو پہچانے بغیر خود کو پہچاننا ناممکن ہے

خودی کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ کائنات کی دیگر اشیاء یا دیگر انسانوں کے حسن و جمال اور جذب و کشش کو دیکھ کر حیران نہ ہو۔ بلکہ اپنے حسنِ معنوی اور کمالاتِ فطری کی جانب متوجہ ہو۔ دنیا اور آخرت میں انسان کی فلاح و کامرانی کا سارا انحصار خودشناسی اور خداشناسی پر ہے۔ خود فراموشی اور خدا فراموشی ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے اور خدا فراموشی میں بھی انسان خود فراموشی ہی کی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے۔ خودی کی قاہری خودی کی اپنی بے پناہ قوتوں کا شعور ہے اور یہی دراصل وسیلہ ہے روحانی حقائق کے ادراک کا۔

اقبال نے خاک کے پتلے کو ایک ساکن اور جامد حالت میں دیکھنے کے بجائے اس میں تغیر، حرکت اور حرارت کی نمو پر زور دیا اور اسے خودی کے حصول کے لیے ایک لمبا سفر اختیار کرنے کی ترغیب دی کیونکہ اس کی استعانت اور استحکام کا راز اس کے مسلسل سفر کی حالت ہی میں مضمر ہے۔ جو سفر کی خارجی سطح پر ہی نہیں بلکہ داخلی اور روحانی سطح پر بھی اہمیت کا حامل ہے اقبال اس خودی کی پرورش اور تربیت کے ذریعے اس مشتِ خاک میں آتشِ ہمہ سوز پیدا کرنا چاہتے ہیں یعنی ایک زندہ خودی جو سنجر و طغرل کی شہنشاہیت کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔

اپنے آپ کو پہچاننا، اپنی فطری صلاحیتوں کی نوعیت کو سمجھنا، ان کی نوعیت کے مطابق ان کی تربیت کرنی اور ان کو بروئے کار لانا یہی وہ سلسلۂ عمل ہے جسے اقبال اپنی مخصوص اصطلاح میں خودی کے تحفظ، ترقی اور تکمیل سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب خودی انسان کے عقائد اور جذبات اور احساسات کی دنیا تعمیر کر چکی ہے اور اوہام اور شکوک و شبہات زائل ہو جاتے ہیں اور یقین اپنے معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو "سراسر عمل" کی راہ ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ یہ عمل خودی کے فروغ کے لیے منزلِ مقصود کی جانب ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتا تاوقتیکہ انسان میں جرأت، جفاکشی اور سخت کوشی کی صلاحیت پیدا نہ ہو اور وہ فطرت و حوادث کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔

چونکہ "عمل" کے لیے کسی محرک کا ہونا ضروری ہے اس لیے اقبال نے محرک کے لیے لفظ "عشق" استعمال کیا ہے جس کی وساطت کے بغیر خودی اپنی نشو و نما اور ارتقا کے اندرونی عمل میں ناکام اور ادھوری رہتی ہے۔ عشق سے مراد یہاں دنیاوی عشق نہیں اور نہ ہی وہ صوفیانہ عشق ہے جو ہماری تصوف کی شاعری میں ملتا ہے بلکہ اس سے مراد اپنے مقصد کی لگن ہے، یہ لگن جتنی شدید ہوگی اتنا ہی آدمی زیادہ قوت اور پختگی کے ساتھ آگے بڑھے گا اور حوصلے سے

مشکلات کا سامنا کرے گا۔ عمل صرف منزل تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں بلکہ اپنی ذات اور اپنے امکانات کو سمجھنے کا وسیلہ بھی ہے مگر خودی کی تعمیر و تشکیل کے لیے اقبال جس عمل کو لازمی قرار دیتے ہیں وہ صرف تعمیری اور اخلاقی عمل ہے۔

اقبال کی یہ خودی اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی کے مدارج طے کر کے ہی تکمیل پاتی ہے اور نیابت الٰہی کے درجہ تک پہنچ جانے پر اس کی خودی مکمل ہوتی ہے، جب تک خودی اپنے مرتبۂ کمال کو نہ پہنچے انسان اپنا مقصد حیات حاصل نہیں کر سکتا۔ خودی میں جذبۂ غیرت و خودداری کے ساتھ ساتھ عجز اور تواضع کی اعلیٰ صفات بھی پائی جاتی ہیں خودی اگر نیازمند بھی ہو تو اپنی غیرت کے حدود سے نکل کر نہیں بلکہ عزتِ نفس کے دائرے میں مقید رہتی ہے۔ اسی طرح اقبال کی خودی کا مطلب تکبر نہیں بلکہ خود شناسی یا "عرفانِ نفس" ہے۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کے فلسفۂ خودی سے مراد خود شناسی، خود اعتمادی اور اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا ایسا شعور ہے جو اشخاص ہی نہیں بلکہ اشیاء کو بھی ترقی اور تسخیر پر ابھارتا رہتا ہے اور کائنات کی ہر چیز جس کے سامنے سرنگوں نظر آتی ہے جسے وہ جب چاہے اپنا مطیع اور تابع فرمان بنا سکتا ہے۔ خودی کی تربیت اور تزئین کے ذریعے اقبال انسان کے دل میں شکست خوردگی اور مایوسی کو دور کر کے امیدوں کا چراغ جلانا چاہتے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ مایوس اور شکست خوردہ انسان ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتا۔ وہ یہ بھی ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ انسان خطا کا پتلا اور گناہوں کا پیکر نہیں۔ اقبال کے مربوط فکری نظام میں خودی انسان کو انسانیت کے مقام شرف پر لانے ہی سے مقصود ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ قوم کا ہر فرد عملی طور پر کامل اور ارتقاء پذیر شخصیت بن کر زندگی بسر کر سکے۔ اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کی مضمرات اور اس کے عناصر ترکیبی پر اچھی خاصی روشنی

"بالِ جبریل" کی مثنوی "ساقی نامہ" کے چھٹے بند میں اس طرح ڈالی ہے:-

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے! — خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے!
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات!
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند!
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک! — من و تو میں پیدا من و تو سے پاک!
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے! — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے!
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی — ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی — دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں — پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں!
سفر اس کا انجام و آغاز ہے — یہی اس کی تقویم کا راز ہے!
کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں! — یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں!
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے — نشیب و فراز و پس و پیش سے!
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر — ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر!

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

امام قفال کبیر شاشیؒ

از

حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

فقہ شافعی کے فلک پر جن ستاروں نے اپنی چمک دمک دکھائی، ان میں سے ایک امام قفال کبیر شاشی ہیں، تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر آب و تاب کے ساتھ کیا ہے، مثلاً ابن خلکان کی عادت ہے کہ جب وہ اعیان علماء و فضلاء کے حالات بیان کرتے ہیں تو عنوان میں محض نام، کنیت، نسبت یا لقب دیتے ہیں مگر انھوں نے امام قفال کبیر کا ذکر اس عنوان کے ساتھ کیا؛

"القفال" (ابو بکر محمد بن علی بن اسماعیل القفال الشاشی الفقیہ الشافعی امام عصرہ بلا مدافعۃ) [1] یہ امام عصرہ بلا مدافعۃ (اپنے زمانہ کے مسلمہ امام) کے الفاظ کا اضافہ ابن خلکان کی عادت کے برخلاف ہے اور اس سے امام قفال کی عظمت ظاہر ہوتی ہے،

امام سبکی نے حسب عادت مقفی مسجع جملوں میں ان کا نہایت دلکش تعارف کرایا ہے، مثلاً امام الجلیل، احد ائمۃ الدھر، ذو الباع الواسع فی العلوم، والید الباسطہ، والجلالۃ التامہ والعظمۃ الوافرہ، "افصح الاصحاب قلماً"، اسرعھم بیاناً، اثبتھم جناناً، اعلاھم اسناداً، ارفعھم عماداً [2]

[1] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۳۶ [2] طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۷۶۔

پیدائش نام و نسب امام قفال کبیر ۲۹۱ھ / ۹۰۴ء میں پیدا ہوئے، نام و نسب یہ ہے:۔ محمد بن علی بن اسماعیل، ابوبکر کنیت ہے مگر قفال کے لقب اور شاشی کی نسبت سے زیادہ مشہور ہوئے، اپنے ہم نام وہم مذہب اور فقہ شافعی کے ایک دوسرے متاخر فقیہ امام قفال مروزی سے فرق و امتیاز کے لیے ان کو قفال کبیر بھی کہا جانے لگا، وہ اپنے پیشہ کی مناسبت سے قفال (قفل ساز) کہلاتے تھے [1] شاشی، ان کے وطن شاش [2] کی طرف نسبت ہے، ان سے پہلے اسی شہر میں ایک دوسرے نامور شافعی فقیہ ابو الحسن علی بن الحاجب بھی گذرے ہیں، جنھوں نے خراسان، عراق، حجاز اور شام وغیرہ جاکر علوم کی تحصیل کی اور امام شافعی

[1] کتاب الانساب: سمعانی، ج ۲ ص ۵۰۴ [2] شاش ماوراء النہر (یعنی دریائے اموریا یا جیحون (روسی ترکستان) سے لے کر وسط ایشیا کے علاقہ) میں سمرقند کے شمال مشرق میں واقع ایک بستی کا نام ہے (المنجد ج ۲ ص ۳۸۱) جس کے باشندے نسلاً ترک ہیں، کسی زمانہ میں یہ شہر علماء و فضلاء سے معمور اور نہایت خوبصورت، سبز پوش مقام تھا، کہا جاتا تھا کہ ماوراء النہر میں اس سے زیادہ نشاط آفریں، دلپسند اور سیر و تفریح کے لائق کوئی اور جگہ نہیں تھی، یہ شہر اس لیے بھی ممتاز حیثیت رکھتا تھا کہ گو ماوراء النہر کے مسلمانوں کی غالب آبادی، فقہ حنفی پر عمل پیرا تھی لیکن اس شہر کے باشندے عام طور پر مسلک شافعی کے پابند تھے، اسی شاش کے متعلق ابو الربیع بلخی نے یہ اشعار کہے تھے

الشاش بالصیف جنہ ومن اذی الحر جُنہ

لکننی یعتر ینی بھا لدی البرد جنہ

"شاش موسم گرما میں جنت اور گرمی کی تکلیف سے بچنے کے لیے سپر ہے، لیکن وہاں سردیوں میں مجھ پر لرزہ و جنون طاری ہو جاتا ہے"۔

یاقوت حموی متوفی ۶۲۹ھ نے لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ میں اس شہر کو خوارزم شاہ (بقیہ ص ۲۷۲)

کے شاگرد، امام یونس بن عبد الاعلی سے فقہ کی تحصیل کی مگر اس علاقہ میں فقہ شافعی کی ترویج امام قفال ہی کے ذریعہ ہوئی [1]

تعلیم و اساتذہ گو اس امام جلیل کے ابتدائی حالات، خاندان اور والدین کے ذکر سے ہم محروم ہیں تاہم ان کے اساتذہ و شیوخ میں امام ابن خزیمہ، ابن جریر، عبد اللہ المدائنی محمد بن محمد باغندی، ابو القاسم بغوی اور ابو عروبہ حرانی وغیرہ اعیان علم و فضل کے نام ملتے ہیں، امام ابن خزیمہ اور ان کے ہم عصر علماء سے انھوں نے خراسان میں سماعت حدیث کی، عراق میں محمد بن جریر طبری اور باغندی سے کسب فیض کیا، جزیرہ میں ابو عروبہ یا عروہ اور شام میں ابو الجہم اور ان کے ہم عصروں سے درس لیا، ان کے علاوہ کوفہ کے علماء سے بھی فیض حاصل کیا [2] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علم کی طلب و تلاش میں انھوں نے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں، چنانچہ ان کے تمام تذکرہ نگاروں نے ان کی اس خوبی کو اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے، ابن خلکان نے لکھا کہ سفر کی وجہ سے ان کی علمی شہرت پورے عالم اسلام میں عام ہوئی [3]

امام قفال کے شیوخ میں امام ابن سریج کا نام بھی لیا جاتا ہے، چنانچہ ابو اسحاق

(بقیہ ص ۲۷۱) محمد بن تکش نے تاخت و تاراج کر دیا، یہاں کے باشندے جلاوطن کر دیے گئے اور عمارتیں، درخت، چشمے اور چمن ویران ہو گئے اور اسے جو نقصان ہوا غالباً اس کی تلافی کبھی نہ ہو سکی (معجم البلدان ج ۵ ص ۱۳-۲۱۲) شاش کے علماء میں عبد اللہ بن عزابہ شاشی بھی مشہور ہیں جنھوں نے علی بن حجر اور امام احمد بن حنبل سے حدیث کی سماعت کی، انکے علاوہ ابو موسیٰ بن ہارون شاشی اور ابو علی الحسن ابو محمد جعفر بن شعیب بھی شاش کے نامور علماء میں سے ہیں (الانساب ج ۲ ص ۲۲۵) [1] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۳۰ [2] تہذیب الاسماء: نووی ج ۲ ص ۲۸۲ [3] وفیات ج ۲ ص ۲۳۰۔

شیرازی، ابن خلکان اور علامہ سمعانی نے صراحتاً تحریر کیا ہے کہ انھوں نے امام ابن سریج سے علوم فقہ کی تحصیل کی [1] لیکن دوسری روایتوں سے یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی، علامہ ابن الصلاح لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ امام ابن سریج سے ان کی ملاقات ہی نہیں ہوئی [2] امام سبکی نے لکھا ہے کہ امام ابن سریج کے انتقال کے وقت امام شاشی سات برس کے تھے، لیکن ہمارے نزدیک یہ سہو ہے کیونکہ ابن سریج کا انتقال ۳۰۶ھ میں ہوا، اس وقت امام قفال اپنے سن ولادت ۲۹۱ھ کے لحاظ سے ۱۴ برس کے تھے۔ قاضی ابن شہبہ نے ابن الصلاح کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ امام قفال جب بغداد تشریف لائے تو اس وقت امام ابن سریج کا انتقال ہو چکا تھا، اس لیے انھوں نے یہاں امام ابن سریج کے ایک شاگرد ابو اللیث شاسوی سے فقہ شافعی کی تحصیل کی [3]

بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے علم کلام کی تحصیل کے لیے امام اشعری کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا، امام سبکی لکھتے ہیں کہ انھوں نے کبر سنی میں امام اشعری سے علوم کلام سیکھے [4] لیکن ہمارے خیال میں امام قفال اس وقت کبیر السن نہیں تھے، کیونکہ جس وقت امام اشعری کا انتقال ہوا ہے اس وقت امام قفال کی عمر صرف تیس برس تھی [5]

جلالت علمی اساتذہ و شیوخ کے ناموں ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام قفال کا ذوق علمی اور انتخاب کس درجہ بلند تھا۔ اسی لیے وہ بعد میں علم و فقہ کی دنیا میں آفتاب عالمتاب

[1] الانساب ج ۲ ص ۳۲۵، طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۳۰، وفیات حوالہ سابقہ [2] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۳۰ [3] طبقات: ابن شہبہ ج ۱ ص ۳۰-۱۲۹ [4] طبقات کبریٰ ج ۲ ص ۱۷۸ [5] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۳۰۔

بن کر روشن ہوئے۔ امام سبکی نے جن شاندار اور پر شوکت الفاظ میں ان کی جلالت علمی کا ذکر کیا ہے اس کا ذکر پہلے آچکا ہے وہ مزید لکھتے ہیں" امام قفال تفسیر، حدیث، کلام، اصول، فروع، زہد و ورع اور لغت و شعر میں یکساں طور پر درجہ امامت پر فائز اور یکتائے زمانہ تھے [1]

امام عبادی کا قول ہے کہ فقہائے شافعیہ میں وہ سب سے زیادہ فصیح البیان اور علوم شریعت میں سب سے زیادہ دقیقہ سنج تھے۔

امام قفال کے ایک شاگرد حلیمی نے کہا کہ اپنے زمانہ میں، میں جن لوگوں سے ملا، ان میں امام قفال سب سے بڑے عالم تھے۔ [2]

امام ابو اسحٰق شیرازی کا بیان ہے کہ وہ بے نظیر تصانیف کے مصنف تھے اور انہی کے ذریعہ ماوراء النہر میں فقہ شافعی کو فروغ حاصل ہوا [3]

ابن خلکان نے ان کو امام العلوم لکھتے ہوئے کہا کہ کم از کم ماوراء النہر کے شافعیوں میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا [4]

سمعانی نے لکھا کہ ان کے علم و فضل کا شہرہ، مشرق و مغرب میں ہوا، وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے علم کی خاطر اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی۔ [5]

امام ذہبی نے ان کو شیخ الشافعیہ کے لقب سے یاد کیا، انھوں نے یہ بھی لکھا کہ وہ محدث فقیہ اور اصول فقہ کے عالم تو تھے ہی، ان کے اشعار بھی بہت خوب ہیں [6]

امام نووی نے ان کو امام زمانہ لکھا ہے اور خاص طور سے اصول فقہ میں انکے تبحر کا ذکر کیا

[1] طبقات کبریٰ ج ۲ ص ۱۷۶ ... [2] طبقات مصنف ص ۲۰، [3] طبقات کبریٰ ج ۲ ص ۱۷۶ [4] وفیات ج ۲ ص ۳۳۷ [5] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۸۳ [6] شذرات الذہب ج ۳ ص ۵۲

امام نووی تفسیر، حدیث، اصول فقہ اور کلام کے مباحث میں بار بار امام قفال شاشی کا حوالہ دیتے ہیں البتہ فقہیات میں امام قفال مروزی کے اقوال کی تکرار کرتے ہیں [1] ابن الصلاح نے ان کی شخصیت کو مجمع علوم سے تعبیر کیا [2]

صاحب شمشیر امام قفال کی حیات اس لیے اور بھی تابدار نظر آتی ہے کہ وہ ذوالریاستین تھے اس لیے قلم کے ساتھ ساتھ انھوں نے شمشیر و سناں سے بھی کام لیا، حلیمی نے اسی لیے ان کو ناصر الدین بالسیف والقلم کے الفاظ سے یاد کیا ہے، اس زمانہ میں رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان سرحدی جنگیں ہوتی رہتی تھیں، ۳۳۹ھ میں سیف الدولہ ابن حمدان سے رومیوں کی سخت جنگ ہوئی، مسلمانوں کی فوج میں دوسرے لوگوں کے ساتھ خراسان اور ماوراء النہر کے مسلمان بھی شامل تھے، جن کے قائد امام قفال شاشی تھے، جنگ کے دوران بادشاہ روم نقفور کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف ایک منظوم رزم نامہ آیا جس میں مسلمانوں پر بہتان، دشنام اور الزام تراشیاں ... کی گئی تھیں اور انھیں دھمکیاں بھی دی گئی تھیں، مسلمانوں کے لشکر میں گرچہ خراسان، شام، مدائن اور عراق وغیرہ کے ایسے اشخاص موجود تھے جن کا شمار ادیبوں، شاعروں اور اہل زبان میں ہوتا تھا، تاہم جواب دینے کی سعادت اور شرف صرف امام قفال کو حاصل ہوا۔

نقفور کے رجزیہ کے بعض اشعار یہ ہیں۔

من الملك الطهر المسيحي رسالة الى قائم بالملك من آل هاشم

اما سمعت اذناك ما انا صانع بلى فعداك العجز عن فعل حازم

نعم وفتحنا كل حصن ممنع فسكانه نهب النسور القشاعم

[1] تہذیب الاسماء حوالہ سابقہ [2] طبقات کبریٰ حوالہ سابقہ۔

وكم ذات خدر حرة علوية منعمة الاطراف فرقى المعاصم

سبينا وسقنا خاضعات حواسرا بغير مهور لا ولا حكم حاكم

وكم وقعة فى الدرب ذاقت كماتكم فسقناكم سوقا كسوق البهائم

ومصر سافتحها بسيفى عنوة واحرز اموالا بها فى غنائم

فان تمروا تنجوكر اما اعفة من الملك المخزى بتقريب المسالم

فعودوا الى ارض الحجاز اذلة وخلوا بلاد الروم اهل المكارم

سافتح ارض الشرق طرا ومغربا وانشر دين الصلب نشر العمائم

اس رزم نامہ کے اناسی اشعار امام سبکی نے نقل کیے ہیں اور جواب میں امام قفال کے ستر اشعار دیے ہیں، ہم یہاں ان کے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔

اتانى مقال لامرئ غير عالم بطرق مجارى القول عند التخاصم

تسمى بطهر وهو للجنس مشرك مدنسة اثواب بالمدانسم

تثبت هداك الله ان كنت طالب لحق فليس الخبط فعل المقاسم

ولا تتكبر بالذى انت لم تنل كلابس ثوب الزور وسط المقادم

ترى نحن لم نوقع بكم وبلادكم وقائع يشنى ذكرها فى المواسم

وعظمت من امر النساء وعندنا لكم الف الف من اماء وخادم

ولكن كرمنا اوظفرنا هدا نتم ظفرتم نكتتم قدوتة لا لائم

فمن مبلغ نقفور عنى مقالتى جوابا لما ابداه من نظم ناظم

لقد اسلمت بالشرق هند وسندها وصين واتراك الرجال الاعاظم

اتتك خراسان تجر خيولها مسومة مثل الجراد السوائم

غزاة شروا العواصم من الاهم بجنانه والله او فى مساوم

تعالوا انما كمكم ليحكم بيننا الى السيف ان السيف اعدل حاكم

ونرجو بفضل الله فتحا معجلا ننال بقسطنطين ذات المحارم

وان تسلموا فالسلم فيه سلامة واهنا عيش للفتى عيش سالم

امام قفال کا جواب جب قسطنطنیہ پہونچا تو وہاں کے مسیحی علماء نے تعجب سے پوچھا کہ یہ اشعار کس کے ہیں؟ بعض نے کہا کہ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ موجود ہیں[1]

شمشیر و سناں کے شور و شغب کے باوجود اس قدر طویل رزم نامہ ان کی حمیت وجرأت کے علاوہ ان کی قادر الکلامی اور برجستہ گوئی کا ثبوت ہے، ان کے علاوہ امام نووی نے بھی ان کے کچھ دوسرے اشعار نقل کیے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

اوسع رحلى على من نزل[2] وزادى مباح على من اكل

نقدم حاضر ما عندنا وان لم يكن غير خبز وخل

فاما الكريم فيرضى به واما اللئيم فمن لم ابل

مسلک اعتزال کا شبہ

امام قفال شاشی سے ایسے کئی مسائل اور خیالات منسوب ہیں جن میں عام علماء کو اعتزال کی چھاپ نظر آتی ہے، ایک بار ابو سہل صعلوکی سے امام قفال کی تفسیر کے بارہ میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ایک رخ سے تو وہ پاک صاف ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو پاکیزہ نہیں ہے گویا معتزلہ کی طرف میلان ہونے

---

[1] طبقات کبریٰ ج ۲ ص ۱۷۹، [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۸۳، امام سبکی نے بھی انہی اشعار کو نقل کیا ہے مگر دوسرے شعر میں بجائے غیر خبز کے غیر بقل کا لفظ ہے۔

کی وجہ سے اس تغیر کا دوسرا پہلو بدنما ہے[1]، امام سبکی نے بھی اعتزال کی طرف ان کے میلان پر اپنی تشویش ظاہر کی، لیکن جب حافظ ابو القاسم ابن عساکر کا یہ قول ان کے سامنے آیا کہ امام قفال ابتداءً اعتزال کی طرف مائل تھے لیکن پھر انھوں نے اشاعرہ کے مسلک کی جانب رجوع کر لیا تو پھر ان کی یہ تشویش زائل ہوگئی، وقد انکشفت الکربۃ بما حکاہ ابن عساکر[2]

بعض مسائل کے تعلق سے دوسرے فقہائے شافعیہ کے یہاں بھی یہ رنگ نظر آتا ہے خود امام ابن سریج کے مسلک پر بھی اعتزال کا اثر تھا لیکن علم کلام میں مکمل دسترس نہ ہونے کی وجہ سے انہیں معذور قرار دیا گیا، مگر امام قفال شاشی تو علم کلام میں درجہ امامت رکھتے تھے اس لیے ان کو معذور قرار نہیں دیا جاسکتا، اسی لیے جب ابن عساکر کے بیان کے مطابق امام قفال کا رجوع ثابت ہوگیا[3] تو پھر علمائے شافعیہ کی ایک بڑی خلش دور ہوگئی۔

تلامذہ | ان کے شاگردوں اور ان سے روایت کرنے والوں میں ابو عبد اللہ حاکم نیشاپوری، عبد الرحمن سلمی، ابو عبد اللہ حلیمی، ابن مندہ اور ابو نصر عمر بن قتادہ جیسے نامور ائمہ فن ہیں، ان میں ابو عبد اللہ حاکم نیشاپوری نہایت نامور اور صاحب مستدرک ہوئے، ان کی تصانیف کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار اجزا کے بقدر تھیں[4]۔ امام اشعری سے امام قفال نے علم کلام کی تحصیل کی تھی۔ لیکن بعض روایتوں کے مطابق امام اشعری نے بھی ان سے علوم فقہیہ کا اکتساب کیا[5] اس سے امام قفال کے علوئے مرتبت کا اندازہ ہوتا ہے کہ گو وہ عمر میں امام اشعری سے بہت چھوٹے تھے لیکن فقہ میں اس قدر مہارت حاصل

---

[1] طبقات کبریٰ ج ۲ ص ۱۷۷، [2] ایضاً [3] طبقات ابوبکر بن ہدایۃ اللہ ص ۲۸ [4] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۹۰ [5] طبقات کبریٰ ج ۲ ص ۱۷۸۔

تھی کہ امام اشعری جیسے یگانہ روزگار ان سے علم حاصل کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے، اگرچہ اس روایت کی صحت میں شک و تردد ظاہر کیا گیا ہے جس کی وجہ شاید یہی ہے کہ امام اشعری ایک ۲۵-۲۶ سال کے نوجوان سے فقہ کا علم کیسے حاصل کر سکتے تھے، چنانچہ قاضی ابن شہبہ لکھتے ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ اسی قسم کی ایک روایت امام ابو اسحٰق مروزی کے متعلق مشہور ہے اور وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے[1]، لیکن ہمارے نزدیک امام قفال کے متعلق بھی یہ روایت صحیح ہو سکتی ہے کہ علم کے حصول میں عمر کا تفاوت کوئی امر مانع نہیں ہے۔

صاحبزادہ | امام قفال سے روایت کرنے والوں میں ان کے ایک صاحبزادہ القاسم کا نام بھی شامل ہے، امام غزالی نے کتاب الرھن میں ان کا ذکر کیا ہے لیکن بجائے القاسم کے انھوں نے ابو القاسم لکھا ہے[2]، ان کی ایک کتاب، کتاب التقریب اہل علم میں متداول تھی[3]، العجلی نے لکھا کہ اصلاً یہ کتاب امام قفال ہی کی ہے، لیکن ابن خلکان نے لکھا کہ انھوں نے سنہ ۶۶۵ھ میں دمشق کے مدرسہ علویہ کے کتب خانہ میں کتاب التقریب کی ۶ جلدیں دیکھی تھیں، مکمل جلدیں شاید دس تھیں، ان پر لکھا ہوا تھا کہ یہ ابو الحسن القاسم بن ابی بکر القفال الشاشی کی تصنیف ہے[4]

تصنیفات | امام قفال کی تصنیفات عمدہ، بے مثل اور بے نظیر خیال کی جاتی تھیں[5]، امام نووی نے ان کی کتابوں کو وقیع ترین بتایا ہے[6]، مگر افسوس ہے کہ ان کی تالیفات سے اب ہم محروم ہیں، کتب خانوں اور مخطوطات کی فہارس میں بھی کوئی نام نظر نہیں آتا۔ علامہ چلپی اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے چند کتابوں کا ذکر کیا ہے، ہم بھی اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

.... [1] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۳۰-۱۳۱ [2] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۲۳، [3] شذرات الذہب ج ۳ ص ۵۲ [4] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۲۳ [5] وفیات الاعیان، طبقات کبریٰ و قاضی ابن شہبہ بحوالہ سابقہ [6] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۷۲۔

۱۔ محاسن الشریعۃ فی فروع الشافعیۃ، یہ نادر مسائل پر مشتمل تھی، بقول علامہ چلپی بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں، اس کا ایک نسخہ قاہرہ کے مدرسہ فاضلیہ میں موجود تھا، یہ تین جلدوں میں تھی، پہلی جلد کا آغاز اس طرح ہوا تھا: الحمد للہ الغنی الحمید، ذی العرش المجید، ذکر الفہا جوابا لمن سال عن علل الشریعۃ الخ[1]

۲۔ شرح الرسالہ، امام شافعی کی کتاب الرسالہ کی شرح تھی، علامہ چلپی نے امام صیرفی، امام ابوالولید حسان بن محمد نیشاپوری، امام ابوبکر محمد جوزقی شیبانی کی نمایاں ترین شرحوں کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے[2]

۳۔ ادب القاضی، علامہ چلپی نے صرف نام کا ذکر کیا ہے،[3]

۴۔ کتاب فی علوم الجدل، علم فقہ کی ایک شاخ علم الجدل ہے، اس فن میں یہ اولین باضابطہ کتاب ہے[4]

۵۔ دلائل النبوۃ، اس کے متعلق امام نووی نے لکھا کہ یہ نہایت نفیس کتاب ہے،[5]

۶۔ کتاب فی اصول الفقہ، شیخ ابواسحٰق شیرازی نے اس کا ذکر کیا اور قاضی ابن شہبہ نے اسے کتاب حسن سے تعبیر کیا ہے۔[6]

۷۔ تفسیر کبیر، اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

وفات تقریباً نصف صدی تک اپنے علم و عرفان سے مخلوق خدا کو فیض پہونچانے کے بعد ۷۴ سال کی عمر میں ذی الحجہ ۳۶۵ھ بمطابق ۹۷۶ء میں شاش میں وہ اپنے

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۳۸۹ [2] ایضاً ج ۱ ص ۵۵۵ [3] ایضاً ص ۳۷، [4] علم الجدل علم مناظرہ کی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر ہے کہ یہ آداب مناظرہ کی معرفت کا علم ہے [5] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۸۲ [6] ایضاً [7] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۳۰۔

رفیق اعلیٰ سے جاملے، امام ابواسحٰق شیرازی کے نزدیک ۳۳۶ھ میں وفات ہوئی، سمعانی کی ایک روایت کے مطابق وفات کا سال ۳۶۶ھ ہے مگر یہ دونوں روایتیں سہو پر مبنی ہیں صحیح اور متفقہ قول ۳۶۵ھ ہی کا ہے۔

بعض اقوال امام سبکی نے ان کے تذکرہ میں ان کے اقوال و مسائل کے لیے عنوان تو قائم کیا مگر پھر انہیں سادہ ہی چھوڑ دیا، غالباً وہ اس کی تکمیل نہیں کرسکے یا تکمیل کی تو وہ مخطوطہ میں شامل نہیں ہوسکے[1] البتہ امام نووی نے دو تین اقوال نقل کیے ہیں اور انہیں غرائب اقوال کہا ہے، ہم بھی بطور تبرک کے ان کو یہاں نقل کرتے ہیں،

ان کا ایک قول یہ ہے کہ بیماری کی وجہ سے جمع بین الصلاتین جائز ہے

عقیقہ کے ایک مسئلہ میں فقہائے شافعیہ کا یہ کہنا ہے کہ عقیقہ میں اگر اتنی تاخیر ہو... کہ بچہ، جوان ہوجائے تو عقیقہ کا حکم غیر مولود کے حق میں ساقط ہوجاتا ہے اور اب اس جوان کو اختیار ہے کہ وہ خود اپنی طرف سے اپنا عقیقہ کرسکتا ہے، باپ یا سرپرست پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے، اس مسئلہ میں امام شاشی یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ وہ جوان اپنی طرف سے اپنا عقیقہ کرے، کیونکہ ایک روایت کے مطابق جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی ہونے کے بعد اپنی طرف سے اپنا عقیقہ کیا، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عق عن نفسہ بعد النبوۃ[2]

---

[1] طبقات کبریٰ ج ۲ ص ۱۸۹ [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۸۳

شفیع المعانی

ہندوستان میں لکھی جانے والی ایک نایاب فارسی فرہنگ

از

ڈاکٹر محمد طارق حسن ریڈر شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

فارسی زبان و ادب کی ترویج میں ہندوستان کا حصہ بھی کم نہیں ہے بلکہ فرہنگ اور تذکرہ نگاری میں ہندوستانی علما و فضلا کو ایران پر فضیلت اور برتری حاصل ہے جس کا اعتراف ایرانی اہل علم نے بھی کیا ہے،

فارسی زبان کا پہلا تذکرہ لباب الالباب، مصنفہ محمد عوفی التمش کے دور ۶۲۳ھ/۱۲۳۵ء میں ہندوستان میں لکھا گیا اس کے کچھ عرصہ بعد علاء الدین خلجی (۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء) کے زمانے میں فارسی زبان کی ایک فرہنگ "فرہنگنامہ فخر قواس"، وجود میں آئی، یہ فرہنگ ہندوستان میں لکھی جانے والی پہلی فارسی فرہنگ ہے اور اہمیت کے اعتبار سے لغت فرس اسدی کے بعد اسی کو خیال کیا جاتا ہے، اس کی تالیف کے بعد ہندوستان میں فرہنگ نویسی کا ایک سلسلہ چل پڑا جو جہانگیر کے دور میں فرہنگ جہانگیری کی تصنیف کے وقت پورے عروج کو پہنچ گیا تھا اور مغلوں کی حکومت کے زوال بلکہ انگریزوں کی حکومت کے ابتدائی دور حکومت تک جاری رہا۔

گو موجودہ دور میں فرہنگ نگاری کی تحقیق و تدوین کا کام شروع ہو گیا ہے مگر اس کے باوجود متعدد اہم لغات تحقیق و تعارف کے محتاج ہیں کیونکہ ان میں سے بعض کا

صرف نام تذکروں میں ملتا ہے اور بعض کے تو ناموں سے بھی اس زمانہ کے اصحاب علم و تحقیق واقف نہیں ہیں اسی طرح کی ایک فارسی لغت شفیع المعانی بھی ہے جس کو امروہہ کے مشہور نوادر فروش توفیق احمد چشتی قادری مالک نیشنل بکڈپو بازار گذاں امروہہ ضلع مرادآباد یوپی اگر لکھنؤ سے حاصل نہ کرتے تو نہ جانے کب تک یہ علمی خزانہ اہل علم کی دسترس سے باہر تھا۔ ذیل میں اس لغت اور اس کے مصنف کے بارے میں جو معلومات مہیا ہو سکی ہیں، پیش کی جا رہی ہیں۔

مصنف: اس کتاب کے مصنف کے نام یا حالات زندگی کے بارے میں معلومات کا تنہا وسیلہ یہی لغت ہے، اس کے علاوہ کسی کتاب میں نہ اس مصنف کا کوئی ذکر ہے نہ اس کی تصنیف کا، بدقسمتی سے کتاب کا مقدمہ بھی موجود نہیں ہے جس سے مصنف کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی، ترقیمہ البتہ موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف فرہنگ کا نام شفیع الدین ہے جو رفیع الدین ولد عیوض محمد کے بیٹے اور قصبہ سیہون سرکار لکھنؤ کے رہنے والے تھے، اسی میں مولف کے دو لڑکے منظر الدین اور ظہیر الدین کا ذکر بھی ملتا ہے جو اہل علم تھے اور انھوں نے مولف کے ساتھ فرہنگ کی کتاب میں حصہ لیا تھا، ممکن ہے کتب کی تالیف میں بھی مدد کی ہو، منظر الدین کے ایک بیٹے حسین الدین تھے جن کو مصنف نے یہ کتاب ھبہ کی تھی، یہ امر اس کا ثبوت ہے کہ ان کے پوتے بھی صاحب علم و ذوق تھے اور ممکن ہے ان کی علمی ضرورت یا تقاضے کی وجہ سے دادا نے یہ کتاب تالیف کی ہو، غرض ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فاضل فرہنگ نگار کا تعلق ایک ایسے علمی گھرانے سے تھا جس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہے۔

ترقیمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ ۱۲۵۰ ہجری مطابق ۱۲۴۱ فصلی میں مکمل ہوا اور

چونکہ خود مولف ہی کا مکتوبہ نسخہ ہے اس لیے یقینی ہے کہ ۱۲۵۰ ہجری میں وہ زندہ تھے اور اس وقت ان کے دو بیٹوں کے علاوہ ایک پوتا حسین الدین بھی موجود تھا جو لغت اور علمی کتابوں کے مطالعہ کے لائق ہو چکا تھا۔ چنانچہ اگر سنہ ۱۲۵۰ھ میں حسین الدین کی عمر ۲۵۔۳۰ سال فرض کر لی جائے تو اس کے باپ مظہر الدین کی عمر ۴۵۔۵۰ برس اور اس کے دادا یعنی مولف لغت شفیع الدین کی عمر ستر اسی سال ماننی پڑے گی۔ اس طرح مولف فرہنگ کا زمانہ پیدائش ۱۱۷۰ اور ۱۱۸۰ کے درمیان قرار پائے گا،

علم و فضل لغت میں نہ کسی جگہ مولف نے اپنی علمی صلاحیت کے بارے میں کچھ لکھا ہے اور نہ اپنے یا اپنے اساتذہ کے حالات کہیں ضمناً تحریر کیے ہیں۔ مقدمہ میں ممکن ہے ان امور کا کچھ ذکر رہا ہو مگر پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ موجود نہیں ہے تاہم مصنف کے صاحب علم و فضل ہونے میں کوئی شک و شبہہ نہیں، لغت جیسے خشک فن سے دلچسپی اور اتنی ضخیم کتاب کی ترتیب و تالیف ہی ان کے علم و فضل اور وسعت مطالعہ کی دلیل ہے انھوں نے اس کتاب کی تالیف کے دوران میں جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے وہ عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہیں، کتاب کے مآخذ میں لغت کے علاوہ قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، تاریخ، جغرافیہ، طب، فلسفہ، معانی، بیان اور دوسرے متعدد فنون کی بہت سی کتابیں ہیں جن میں سے بعض کے نام ترجمۂ الفاظ کے ذیل میں ضمناً آگئے ہیں، کتاب کے مطالعہ سے مصنف کی وسعت نظر کثرت مطالعہ اور عمیق علمی ذوق کا ثبوت ملتا ہے، قرآن، حدیث، تفسیر و فقہ کی کتابوں کے حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ طبقہ علما سے تعلق رکھتے تھے اور ان کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور تھا۔

مسلک و مشرب فرہنگ شفیع المعانی کے مولف شفیع الدین مسلک اہل سنت والجماعت

سے وابستہ تھے چنانچہ صدیق اور فاروق الفاظ کے ذیل میں جو ترجمہ انھوں نے تحریر کیا ہے وہ اس کا واضح ثبوت ہے مولف لکھتا ہے

صدیق : ..... دوست و دوستاں ... و بکسر و تشدید دال لقب خلیفہ اول است رضی اللہ عنہ (ورق ۳۱۲)

فاروق : لقب امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ......

اسی طرح حضرت حمزہؓ کو سید الشہدا لکھنا بھی ان کے سنی المسلک ہونے پر دال ہے۔

اسی طرح مولف حنفی مذہب کا ماننے والا ہے وہ امام ابو حنیفہ کو صرف امام لکھنے پر قانع نہیں ہوتا بلکہ امام اعظم قرار دیتا ہے چنانچہ نعمان کے ذیل میں جو ترجمہ دیا گیا ہے وہ ملاحظہ ہو:

نعمان : ..... و نیز نام امام اعظم است بو حنیفہ کوفی ......

جبکہ امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے تحت صرف اسقدر تحریر ہے،

مالک : ...... و نام صاحب مذہب ......

حنبل : ..... و نام فرنوی صاحب مذہب کہ او را احمد حنبلی گویند .....

مصنف کے بارے میں یہ معلومات بیان کرنے کے بعد اب ہم خود کتاب کی اندرونی شہادتوں سے اس کے بارے میں کچھ اہم اور مفید باتیں درج کرتے ہیں۔

کتاب کا نام سرورق پر اس کتاب کا نام شفیع اللغات غلط فہمی کی وجہ سے لکھ دیا گیا ہے، اس کا اصل نام مصنف نے اپنے نام کی مناسبت سے شفیع المعانی رکھا تھا، نام کی صراحت ترقیمہ کی عبارت میں واضح طور پر کی گئی ہے

" تمام شد کتاب ہذا مسمی فرہنگ شفیع المعانی ...."

زمانۂ تالیف کتاب کے سن تالیف کے بارے میں کوئی درست اطلاع بہم نہیں، تاہم اتنا ظاہر ہے کہ یہ نسخہ بخط مصنف ہے، علاوہ ازیں حاشیہ پر بہت سے اضافے اور اصلاحات بھی اسی خط میں موجود ہیں اس لیے قیاس یہی کہتا ہے کہ لغت کی تالیف کے بعد یہ نسخہ اس کی پہلی نقل ہے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اصل مسودہ یہی ہو، جس کے شروع میں کچھ صفحے مصنف نے خود لکھے ہوں اس کے بعد اپنے بیٹوں کو املا کرا دیے ہوں، یہاں تک کہ ۱۱ جمادی الثانی ۱۲۵۰ہجری کو یہ کتاب مکمل ہوئی ہو اگر یہ قیاس صحیح ہے تب تو تاریخ تالیف ۱۴ جمادی الثانی ۱۲۵۰ہجری متعین ہو ہی جاتی ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہے بلکہ یہ نسخہ اصل مسودہ کی نقل ہے تب بھی مصنف کا مبیضہ ہونے کی وجہ سے قرین قیاس یہی ہے کہ اصل کتاب اس نسخہ سے کچھ ہی پہلے مکمل ہوئی ہوگی گویا اس کتاب کا زمانۂ تالیف ۱۲۵۰ہجری یا اس سے کچھ ہی قبل قرار پاتا ہے،

کتاب کے مآخذ اگرچہ مقدمہ نہونے کی وجہ سے یہ بات یقینی نہیں کہ مولف نے کن کن مآخذ سے استفادہ کیا ہے اور فرہنگ کی تالیف کے سلسلہ میں کون سی تصانیف ان کے پیش نظر رہی ہیں لیکن دوران مطالعہ متن و حواشی میں الفاظ کے ترجمہ کے ضمن میں جن مآخذ کے نام نظر آتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

لغات ۱- فرہنگ ابوحفص سعدی ۲- دستور (الافاضل) ۳- شمس فخری (معیار جمالی) ۴- ادات الفضلا ۵- قنا (الطالبین) ۶- زفان گویا ۷- شرفنامہ ۸- (فرہنگ) سکندری ۹- موید الفضلا ۱۰- مدار الافاضل ۱۱- کشف اللغات ۱۲- فرہنگ ابراہیمی ۱۳- فرہنگ جہانگیری ۱۴- فرہنگ رشیدی ۱۵- حل اللغات ۱۶- منتخب اللغات ۱۷- سراج اللغات ۱۸- اصطلاحات وارستہ ۱۹- شرح نصاب ۲۰- فرہنگ منظوم ۲۱- برہان قاطع -

فارسی کے علاوہ عربی کی

۲۲- صراح ۲۳- کنز اللغات ۲۴- قاموس ۲۵- تاج (الاسامی) ۲۶- سامی (السامی فی الاسامی) ۲۷- سامانی وغیرہ کے نام بھی آئے ہیں۔

لغات کے علاوہ جن کتابوں کے نام بطور حوالہ اس لغت میں آئے ہیں ان میں قرآن پاک - احادیث نبویہ (بغیر صراحت نام مجموعہ) تفسیر زاہدی - شرح مخزن - اشارات شیخ ابو علی سینا - تاج مآثر - بوستان سعدی - مثنوی مولانا روم وغیرہ ہیں۔

ان ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولف فرہنگ اپنے سے پہلے لکھی جانے والی بیشتر فرہنگوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ انھوں نے اس سے استفادہ بھی کیا تھا۔ البتہ دستور ادات، زفان، شرفنامہ اور خاص طور سے لغت ابوحفص سعدی کے ناموں سے دھوکہ نہ ہونا چاہیے کہ یہ کتابیں مولف کے پیش نظر تھیں بلکہ شاید موید الفضلا یا جہانگیری سے استفادہ کے وقت ضمنی طور پر یہ نام بھی آگئے ہیں ورنہ اپنے پیش نظر کتابوں میں ان کے حوالے دیکھ کر ان سے براہ راست استفادہ نہ کرنے کے باوجود ان کے نام دیدیے ہوں۔ ....

اس دور میں یہ کتابیں نہ صرف عام نہیں تھیں بلکہ ادات، زفان اور دستور تو بالکل ناپید تھیں اور بہت بعد میں دریافت ہو کر عام ہوئی ہیں فرہنگ ابوحفص آج بھی نایاب ہے البتہ شرفنامہ سے غالب نے استفادہ کیا تھا اور بعد میں فرہنگ نظام کے مولف نے ان میں سے بیشتر ان لغات کو دیکھا جو حیدرآباد کے کتبخانوں میں موجود تھیں۔ فرہنگ ابراہیمی شرفنامہ کو بھی کہتے ہیں اور ایران میں لکھی جانے والی ایک دوسری فرہنگ کا نام بھی ہے جو ہندوستان میں عام نہیں رہی البتہ جہانگیری کے مآخذ میں ہے شاید یہ نام بھی وہیں سے آیا ہوگا فرہنگ منظوم سے کون سی فرہنگ مراد ہے معلوم نہ ہو سکا کیونکہ اس نام

کی کوئی خاص لغت موجود نہیں البتہ مختلف ناموں سے منظوم لغات لکھے گئے ہیں جو موجود بھی ہیں۔

عربی فارسی لغات کے علاوہ جن کتابوں کے نام ماخذ کے ضمن میں تحریر ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف نہایت وسیع المطالعہ شخص تھا، عربی فارسی دونوں زبانوں میں مہارت رکھتا تھا، قرآن و حدیث اور تفاسیر پر نظر رکھتا تھا جن کے حوالے اس کے یہاں ملتے ہیں، شرح مخزن اور تاج مآثر بھی اس کے پیش نظر تھیں۔ تفسیر زاہدی کا حوالہ جس طرح دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مولف کے سامنے رہی ہے اس طرح اشارات کا ذکر بھی چشمدید معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ یہ ضروری نہیں کہ تمام ہی ماخذ کا ذکر ضمناً آگیا ہو قوی امکان ہے کہ ان کتابوں کے علاوہ دیگر ماخذ سے بھی مولف نے استفادہ کیا ہوگا۔ جن کے نام تحریر میں نہیں آئے ہیں۔

اگر یہ بات درست ہے اور بظاہر اس کے درست نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں تو یقیناً یہ لغت اپنے ماخذ کی کثرت کے لحاظ سے آخری دور میں ہندوستان میں لکھی جانے والی فارسی لغات میں اہم قرار پاتی ہے،

ماخذ کا استعمال | اکثر قدیم فرہنگ نویسوں کا طریقہ بلکہ یہ عیب رہا ہے کہ وہ اپنے ماخذ سے بغیر تحقیق و تنقید کے مواد نقل کر لیتے ہیں اور چھان بین کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے تاہم شرفنامہ کسی قدر اور جہانگیری، رشیدی اور سراج بڑی حد تک اس کمی کو دور کرتے ہیں۔ ہمارا مولف بھی اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ وہ محض کتابوں کا ناقل نہ رہے بلکہ اپنی قوت نقد کو کام میں لاتے ہوئے ماخذ کی اطلاعات پر نظر ڈالتا ہے اور جہاں کہیں ماخذ میں اسے غلطی نظر آتی ہے (جس کا موقع بہت کم ملا ہے) تو اپنی رائے کے اظہار کے ساتھ

اس کی نشاندہی بھی کر دیتا ہے چنانچہ ذیل کی مثالیں بطور نمونہ پیش کی جا سکتی ہیں۔

آب حرام | شراب و نیز کنایہ لذت عشق و محبت است لیکن آب حرام ازان گفتہ کہ زاہدان از و محروم اند کذانی الموید و ایں معنی اخیر ہیچ لطفی ندارد

استرنگ | بالکسر مردم گیا ... و در قاموس گوید بیخ تفاح وحشی است بصورت انسان و آنچہ گفتہ اند کنندہ آن بمیرد خلاف واقع است و در شرفنامہ گوید کہ بہندی لکھنان گویند و مکرر آزمودہ شدہ آن خاصیت ندارد۔

غالباً میر تقدیر صحت نقل حکمت الٰہی در ان این است کہ مردم بدانند کہ ہر گاہ گیاہ بصورت آدم موجب قصاص است کشتن آدم چگونہ موجب قصاص و مستوجب عذاب نباشد۔

آبچین | جامہ کہ بعد از غسل بدن مردہ پاک کنند و چادری کہ از حمام برآمدہ عرق بدان و سامانی گوید قسطنطنیہ کہ بدان بدن خشکانند بعد از غسل و خصوصیت بمیت ندارد چنانچہ جہانگیری گمان بردہ و توہم او از خصوصیت مقام ناشی است و آن معتبر نیست،

تلفظ | فارسی کی ابتدائی فرہنگوں میں تلفظ ضبط کرنے کا کوئی خاص التزام نہ ہوتا تھا شرفنامہ پہلا فارسی فرہنگ ہے جس میں اس سلسلے کی باقاعدہ کوشش نظر آتی ہے۔ اور لفظ کا تلفظ بڑی حد تک متعین ہو جاتا ہے لیکن یہ سلسلہ برابر جاری نہ رہ سکا کچھ عرصہ بعد برہان قاطع اور سراج کے زمانہ میں اس طرف باقاعدہ توجہ ہوئی اور الفبائی ترتیب کا رواج ہوا۔

مولف شفیع المعانی نے اس طرف اس طرح توجہ نہیں کی جس طرح اس کے بعض پیشرو کر چکے تھے، وہ تلفظ کے لیے اکثر مندرجہ ذیل طریقے اختیار کرتا ہے،

۱۔ صرف پہلے حرف کی حرکت بیان کر کے جیسے : بحر بالفتح دریا

۲۔ پہلے اور دوسرے حرف کی حرکت کے ساتھ جیسے : بذر بفتح اول و سکون ذال نقطہ دار .....

۳۔ کئی حرفوں کی تفصیل کے ساتھ جیسے : پذیرفتار با بائے فارسی و ذال نقطہ دار و فوقانی بالف کشیدہ ......

۴۔ پہلے اور تیسرے حرف کی حرکت کے ساتھ جیسے بربر بفتح ہر دو بائے تازی.....

۵۔ بیشتر ہموزن عام فہم کلمہ تحریر کر کے جیسے : پامیز بفتح بائے فارسی و یائے تحتانی بوزن دلیر... پرگار بابا و کاف ہر دو فارسی بروزن سردار ...... پرخار بروزن بردار... وغیرہ

ترتیب | الفاظ کی ترتیب کے سلسلے میں بھی قدیم فرہنگوں میں مختلف طریقے استعمال کیے گئے ہیں جو اس وقت کی مجبوریوں اور تقاضوں کے لحاظ سے مناسب بھی تھے اور ضروری بھی۔ شفیع المعانی کے مولف نے قدیم الایام سے رائج عام طریقہ اختیار کیا ہے یعنی پہلے حرف کو باب اور آخری حرف کو فصل قرار دیا ہے مثلاً لفظ بار دباب الباء فصل را میں ملے گا جیسے ہمارا مصنف اس طرح لکھتا ہے باب الباء مع الراء اور کلمۂ باری باب الباء مع الیای میں گویا موجودہ لغت کی ترتیب الفبائی نہیں ہے اس وجہ سے لفظ کی تلاش میں عام لوگوں کو دشواری ہوتی ہے، البتہ پہلے اور آخری حرف کے درمیان جو حروف آئے ہیں ان میں سختی کے ساتھ الفبائی ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے جو اس دشواری کو کسی حد تک کم کر دیتا ہے۔

شواہد | اگرچہ عام قدیم لغات کی طرح شفیع المعانی میں بھی الفاظ کے تعین کے لیے شعری شواہد نہیں دیے گئے ہیں جن سے کلمے کے تلفظ کے سمجھنے میں بھی بعض اوقات دشواری ہوتی

ہے لیکن چونکہ پہلا اور آخری حرف متعین ہے اور درمیانی حروف میں الفبائی ترتیب پیش نظر رکھی گئی ہے اس لیے تلفظ کے تعین میں غلطی کا امکان کم ہو جاتا ہے البتہ معنی کے تعین میں شواہد سے جو مدد ملتی ہے اس سے اس فرہنگ کا قاری محروم رہتا ہے، یوں بھی کچھ طباعت کے عام ہونے کی وجہ سے اور کچھ حجم کی زیادتی اور کلمات کے احاطے میں وسعت کے سبب شعری فرہنگیں عام لغات کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھیں اس لیے شفیع المعانی میں شرفنامہ و جہانگیری وغیرہ کے طرز کو ترک کر کے سراج وغیرہ کی پیروی کی گئی ہے، اس کے باوجود شعری شواہد بالکل ناپید بھی نہیں ہیں جیسے اندیک کے ترجمہ کے ذیل میں بطور شاہد عمارہ مروزی کا شعر دیا گیا ہے اسی طرح تاج مآثر سے ایک شعر انکشر کے شاہد کے طور پر نقل کیا گیا ہے شرح قرآن اور بوستان کے چند اشعار بھی بطور شاہد استعمال ہوئے ہیں دیگر شعراء میں انوری، مولانا روم، شمالی دستانی، سعدی وغیرہ کے نام ملتے ہیں

دیگر خصوصیات | شفیع المعانی کی خصوصیات میں ایک تو کثرت مآخذ ہے، میرے خیال میں جہانگیری کے بعد اور فرہنگ نظام سے پہلے اس دور میں کسی مولف کے پیش نظر اس قدر لغات نہیں رہے ہیں۔ پھر ان مآخذ سے تحقیق نظر کے ساتھ استفادہ بھی اس لغت کو دوسری فرہنگوں کے مقابلے میں امتیاز عطا کرتا ہے۔

اس لغت کی ایک اور خصوصیت وضاحت کے ساتھ معنی کی پیشکش ہے دوران مطالعہ اندازہ ہوتا ہے کہ عام مواقع سے قطع نظر بہت سے الفاظ کے تراجم میں بڑی وضاحت اور علمی دقت نظر سے کام لیا گیا ہے، اس سلسلے کی مثالیں اس مختصر تعارف کو بہت گرانبار کر دیں گی اس لیے ان الفاظ میں سے چند کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے:

ارغنون، آبگین، ارسلان، استرنگ، اصطرلاب، زحل سعد، سکندریہ، ماخچی، وا،

یکدانہ وغیرہ وہ الفاظ ہیں جن کے معنی کافی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں جبکہ بیشتر دوسرے لغات میں ایک دو جملوں بلکہ لفظوں میں بات ختم کر دی گئی ہے۔

ہندوستانی الفاظ | بعض قدیم فرہنگوں کی طرح شفیع المعانی کی ایک اہم خصوصیت فارسی، عربی الفاظ کے ترجمہ کے ذیل میں ان کے متبادل ہندوستانی الفاظ کا استعمال ہے، یہ وہ الفاظ ہیں جو مختلف دور میں مختلف علاقوں میں استعمال ہوئے تھے۔ قدیم لغات میں ان کا ذکر ان الفاظ کی تاریخ کے سلسلے میں معاون ہوتا ہے تو متاخرین کے یہاں مختلف علاقوں کے لہجوں کے فرق کا پتہ دیتا ہے اردو زبان کی تحقیق میں یہ قیمتی سرمایہ بہت معاون ہو سکتا ہے، راقم الحروف نے فارسی لغات میں ہندوستانی عناصر کے زیر عنوان ان الفاظ کو بڑی حد تک یکجا کر لیا ہے جو آیندہ کبھی پیش کیا جائے گا۔

شفیع المعانی کے مصنف نے بھی سینکڑوں اردو الفاظ فارسی الفاظ کے متبادل کے طور پر ذکر کیے ہیں جو ایک علٰحدہ مضمون کے متقاضی ہیں یہاں چند الفاظ بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں۔

آنجور... ہندی گھانٹ (گھاٹ) خوانند۔

اشخار... ہند ساجی دکھار گویندش

انگشر... ہندوی آنکس گویند

ابن عرس... ہند نیول گویند وغیرہ

غلطیاں | شفیع المعانی میں گوناگوں خوبیوں کے باوجود بعض غلطیاں بھی نظر آتی ہیں ان میں سے چند کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

ساؤج: بجیم فارسی بوزن مالوس نام مقامی مسکن سلیمان شاعر معروف....

اول اس مقام کا نام 'ساوہ' ہے ساؤج نہیں، خود مولف فرہنگ نے 'ساوہ' کے ذیل میں تحریر فرمایا ہے: نام شہریست، دوسرے شاعر کا نام سلیمان نہیں سلمان ہے جو ساوہ کا مشہور شاعر ہے اور سلمان ساوجی کہلاتا ہے

شب گاہ: | باکاف فارسی شب آنگاہ است یعنی آنجا کہ شب کنند.... یہ معنی یعنی شب آنگاہ درست نہیں صحیح معنی شبانگاہ ہے وقت در آمدن شب،

اندود | کاھگل وگلایہ...

گلایہ بایا نہیں بلکہ گلابہ ہونا چاہیے یعنی گل + آبہ اسی طرح ترقیمہ میں تحریر ہے

"تمام شد کتاب ھذا.... بمقام لکھنؤ باختمام رسید....'

کلمہ اختتام جیسا خود اس فرہنگ میں باب الالف مع المیم میں تحریر ہے "پاک کردن چاہ وخانہ روفتن" کے معنی میں ہے لیکن ترقیمہ لکھتے وقت مولف کے ذہن میں ختم اور خاتمہ کے الفاظ تھے اسی سے مشتق سمجھ کر انھوں نے اختمام بمعنی خاتمہ تحریر کیا ہے ورنہ درست کلمہ اختتام ہے اختمام نہیں،

ممکن ہے، اس طرح کی چند اور غلطیاں بھی کوشش سے نکالی جا سکیں لیکن اتنی ضخیم کتاب میں اتنی بہت سی خوبیوں کے ساتھ یہ چند غلطیاں (اگر نہ ہوتیں تو یقیناً بہتر ہوتا) بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں،

غرض "شفیع المعانی" فارسی زبان کی ایک اہم لغت ہے جس میں عربی فارسی کے بیشتر مروج الفاظ کا احاطہ کیا گیا ہے، ترکی کے مستعمل الفاظ بھی ترجمہ کیے گئے ہیں لیکن شرفنامہ یا موید کی طرح ترکی کے لیے علٰحدہ فصل قائم نہیں کی گئی ہے۔ ماخذ کی کثرت اور ان کے درست استعمال کے سبب بھی اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ اس زمانے میں دساتیر کے

جعلی لغات کا جادو ہندوستان میں عام تھا۔ برہان اور قاطع برہان دونوں کے مولفین اس جادو کے اسیر رہے ہیں لیکن مولف شفیع المعانی پر یہ جادو چڑھتا نظر نہیں آتا کیونکہ یہ جعلی لغات اس فرہنگ میں نظر نہیں آتے۔ اگرچہ یہ لغت سراج یا جہانگیری کے مرتبہ کو نہیں پہنچی لیکن موید اور آنند راج کی طرح محض مآخذ کی نقل بھی نہیں ہے۔ آزادانہ رای اور تنقیدی نظر کی جھلکیاں اس میں جابجا نظر آتی ہیں۔ ضخامت کے پیش نظر ہی شاید شعری شواہد سے صرف نظر کی گئی ہے ورنہ اس کا حجم جہانگیری اور آنند راج سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔ سراج و رشیدی کی طرح بہت سے الفاظ کے معنی دیگر عام لغات سے کہیں زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

موجودہ نسخہ شفیع المعانی کا موجودہ نسخہ مشہور نوادر فروش اور دیوان غالب بخط غالب کے دریافت کنندہ توفیق احمد قادری امروہی مالک نیشنل بکڈپو امروہہ کا مملوکہ ہے جو انھوں نے لکھنؤ کے کسی کتبخانے سے حاصل کیا ہے، یہ نسخہ بخط مصنف ہے اور شاید دنیا کا واحد نسخہ ہے کیونکہ کسی فہرست میں اس کا ذکر نہیں ہے، نہ کسی اور ذریعے سے اس کے کسی دوسرے نسخہ کی اطلاع ملتی ہے۔ نیز یہ لغت اب تک چھپ کر عوام تک نہیں پہنچا ہے نسخہ کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

یہ نسخہ ۴۰۷ اوراق پر مشتمل ہے، اس کا سائز ۱۳½" × ۱۹/۲" ہے، ہر صفحہ پر ۲۵ سطریں ہیں، الفاظ سرخ (شنگرفی) روشنائی سے لکھے گئے ہیں، ترجمہ سیاہ روشنائی میں ہے، کاغذ روئی کا بنا ہوا ہے، شروع سے ایک ورق غائب ہے جس کی وجہ سے مقدمہ ضائع ہو گیا ہے۔ نسخہ کا آغاز ورق ۲ لف سے اس طرح ہوتا ہے۔

باب الالف مع الالف ۱۱ مروزن جام آمدن یعنی بیا ... الخ

ابتدائی چند صفحات کے آخری حصے گل گئے ہیں یا کرم خوردگی کی وجہ سے ضایع ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے ان صفحات میں ایک ایک دو دو سطریں کم ہیں باقی پورا نسخہ نہایت اچھی حالت میں ہے ترقیمہ اس طرح ہے:

تمت تمام شد کتاب ہذا مسمی فرہنگ شفیع المعانی تالیف شفیع الدین ولد رفیع الدین ابن عیوض محمد ساکن قصبہ آسیون سرکار لکھنؤ مضاف صوبہ اودھ اختر نگر بخط شفیع الدین و منظر علی ولد و ابن مرقوم و ظہیر الدین ولد شفیع الدین مسطور بتاریخ چہاردہم جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ ہجری مطابق یکم ماہ کاتک[۱] ۱۲۴۱ فصلی یکپاس روز برآمدہ روز شنبہ بمقام لکھنؤ باختتام رسید، چوں کتاب ہذا را بہ برخوردار لخت جگر نور دیدہ حسین الدین ولد ظہیر الدین مذکورہ ہبہ نمودم و بخشیدم، برخوردار مذکور کتاب ہذا را مالک و مختار است فقط

جیسا کہ ترقیمہ سے معلوم ہوتا ہے یہ نسخہ تین لوگوں کے خط میں لکھا ہوا ہے گمان غالب یہ ہے کہ پہلا خط جو ورق ۲ سے ورق ۸۰ تک ہے خود مصنف کا ہے اس کے بعد ورق ۶۹ سے ورق ۲۰۲ تک دوسرا خط ہے ۲۰۲ سے ۲۰۵ تک پھر وہی پہلا خط ہے اس کے بعد کہیں پہلا کہیں دوسرا اور کہیں تیسرا خط نظر آتا ہے تمام صفحات کے حاشیے اضافوں سے بھرے ہوئے ہیں جن میں جگہ جگہ کانٹ چھانٹ کی گئی ہے یہ حاشیے بیشتر پہلے خط میں ہیں یہ حک و اضافے واضح بخط مولف ہیں اور اس سے بھی اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ یہ نسخہ مولف کا مسودہ ہے یا مسودہ کی پہلی نقل۔ پہلا خط نستعلیق پختہ ہے دوسرے خطوط بھی نستعلیق معمولی ہیں۔

---

[۱] "جنتری صد سالہ مولفہ قطب الدین مطبع نامی شہر لکھنؤ صفحہ ۱۳۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴ جمادی الثانی روز شنبہ ۱۲۵۰ھ میں ۱۸ اکتوبر ۱۸۳۴ء تھی "شفیع اللغات" کے مولف نے اس سنہ ہجری میں ۱۲۴۱ء فصلی تحریر فرمائی ہے جو بالکل غلط ہے بلکہ یہ ان کا سہو کتابت ہے اسی سن ہجری میں ۱۲۴۲ فصلی ہے نہ کہ ۱۲۴۱ فصلی"

رامائن کے اُردُو ترجمے

از

جناب عطا خورشید صاحب ریسرچ فیلو خدا بخش لائبریری پٹنہ ۴

ہندوؤں نے اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان کا بھی سہارا لیا ہے جس کے نتیجے میں اردو زبان میں ہندوؤں کے مذہبی لٹریچر کا معتد بہ ذخیرہ موجود ہے۔ ہندوؤں نے اپنے اسی تبلیغی جذبہ کے تحت مستقل کتابیں بھی تصنیف کیں اور اپنی مقدس کتابوں کے اردو ترجمے بھی کیے۔ ان کی مقدس کتابوں میں رامائن کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ گو رامائنیں متعدد لکھی گئیں، لیکن سب سے زیادہ مقبولیت والمیکی کی رامائن اور تلسی داس کی "رام چرت مانس" کو حاصل ہوئی۔ اس مقبولیت کی دلیل وہ ڈھائی سو ترجمے ہیں جو اردو میں کئے گئے، اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک فرقہ و مذہب کی زبان نہیں۔

معارف اکتوبر و نومبر ۱۹۸۹ء کے شماروں میں رام لعل نابھوی صاحب نے رامائن کے اردو تراجم کی ایک فہرست پیش کی ہے۔ مقالہ نگار نے فہرست کی تیاری میں کافی محنت سے کام لیا ہے اور کتابوں کے حصول کے سلسلے میں بھی کافی سعی کی ہے۔ وہ اس حیثیت سے لائق ستائش ہیں کہ بکھرے موتیوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کامیاب کوشش کی ہے پھر بھی رامائن کے کچھ ترجمے قلم انداز ہو گئے ہیں، جس کی ایک فہرست ذیل میں

پیش کی جاتی ہے۔

اس فہرست کو میں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ رامائن کے خالص ترجمے پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا حصہ جزوی رامائن کی حیثیت رکھتا ہے یعنی اس ذیل میں ان کتابوں کو رکھا ہے جو خالصتاً رامائن کے ترجمے تو نہیں لیکن رامائن کے موضوع سے قریب تر ہیں۔ پہلے حصے کی ترتیب مترجم کے نام / تخلص؛ وار ابجدی ترتیب کے تحت رکھی گئی ہے جبکہ دوسرے حصے کو عنوان وار الفبائی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔ کیفیت کے خانے میں میں نے مخففات کے ذریعہ ان جگہوں کا ذکر کر دیا ہے جہاں یہ نسخے پائے جاتے ہیں۔

مخففات	مخففات کی اصل مراد
آزاد	مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ادبیات اردو	فہرست مطبوعات کتبخانہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن
اردو	اردو میں ہندوؤں کا مذہبی ادب - سید نہال اختر سہ ماہی زبان و ادب (پٹنہ) اپریل - جون ۱۹۷۷ء
اصغر	راجہ راجیشور راؤ اصغر۔ ٹی نرسہری
افق	لمعات افق۔ منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی
بخش	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
پالوی	اردو کے ہندو مثنوی نگار۔ عطاء اللہ پالوی
پبلک	پبلک لائبریری، دہلی،
پریم	پریم ساگر مترجمہ سوامی دیال (نولکشور، لکھنؤ ۱۸۹۱ء) میں چند کتابوں کی اشتہاری فہرست

....	....
جامعہ	ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ، نئی دہلی
جگر	یادرفتگاں۔ شیام موہن لال جگر بریلوی
جوگ	جوگ بشست مترجمہ سوامی دیال میں اشتہار
رامائن	رامائن اردو میں۔ مظفر حنفی۔ ہماری زبان (دہلی) ۲۲ نومبر و یکم دسمبر ۱۹۷۷ء
رضا	رضا لائبریری، رامپور
رفیق	ہندوؤں میں اردو۔ رفیق مارہروی
رنجن	بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ
زیدی	مثنوی نگاری۔ علی جواد زیدی
سہائی	سہائی رامائن حصہ دوم مصنفہ رام سہائی کپورکے آخری صفحہ کا اشتہار
عبدالحق	قاموس الکتب جلد اول مرتبہ عبدالحق
عزیز	اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ۔ محمد عزیز
صمد	اردو ریسرچ سنٹر، حیدرآباد
عشرت	ہندو شعرا۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت
فرخ	تذکرہ شعرائے فرخ آباد۔ شکنتلا سوج
کرشن	کرشن کماری مصنفہ نارائن کے آخری صفحہ کا اشتہار

کشمیر ۱	بہار گلشن کشمیر جلد اول۔ برج کشور بینجر
گنپت	اردو شاعری کے ارتقا میں ہندوؤں کا حصہ۔ گنپت سہائے سریواستو
موج	موج گنگ۔ جوہر دیوبندی
مہابھارت	"بچوں کے لیے مہابھارت" مصنفہ شیو ناتھ رائے کوشل کے صفحہ ۳۰۷ کا اشتہار

رامائن

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مترجم	ناشر/مطبع	سنہ طباعت	صفحات	کیفیت
۱	بال کانڈ (رام چرتر مانس) قلمی	؟	؟	؟	۱۱۸	گنجبخش
۲	رام گیتا قلمی	؟	؟	؟	۲۹۸	گنجبخش
۳	کتھا رام سمید دوار کنڈ (قلمی)	؟	؟	؟	۱۸۰	گنجبخش
۴	بالمیکی رامائن	؟	بھائی جوار سنگھ کرپال اینڈ کو، امرتسر	؟	۳۰۴	گنجبخش
۵	رامائن بطرز ناول	ٹھاکر راجہ چند شاہ پوریہ	لاہور	؟	؟	جامعہ کرشن
۶	ادھیاتمہ (رامائن کا ترجمہ)	راجہ راجیشور راؤ اصغر	؟	؟	؟	اصغر ص۲۹
۷	رامائن منظوم	دوارکا پرشاد افق لکھنوی	؟	؟	؟	اردو۔ (رامائن یک قافیہ کے علاوہ)
۸	رامائن افق	"	؟	۱۸۸۵ء سے قبل	؟	افق ص۱۳۷، جگر ص۲۹۷
۹	مکمل بالمیکی رامائن	"	نیو آرٹ پرنٹنگ ورکس، لاہور	۱۹۲۱ء	۱۱۵۲	اردو عبدالحق، عزیز افق ص۱۶۵ جگر ص۲۹۷، رامائن، رفیق ص۲۳۳
۱۰	رامائن مسدس	"	؟	؟	؟	افق ص۲۱۵

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف / مترجم	ناشر / مطبع	سنہ طباعت	صفحات	کیفیت
۱۱	تلسی رامائن نمبر	رسالہ "اوم" دہلی		جنوری فروری ۱۹۵۱ء	۷۸۴	بخشش۔ (مکمل ترجمہ)
۱۲	آورش رامائن	بہاری لال نشانت	ویدک پرارتھنا سبھا پٹیالہ	؟	؟	پبلک
۱۳	رامائن نثر	پرم ارتھ آنند	؟	؟	؟	رامائن
۱۴	رامائن بال کانڈ و سندر کانڈ	تلسی داس، مترجم؟	؟	۱۸۸۷ء	؟	اردو، عبدالحق
۱۵	رامائن	رام سہائے تمنا لکھنوی	؟	؟	؟	بالوی ص ۲۸۲، زیدی ص ۱۹۱، موج ص [illegible]
۱۶	بچتر رامائن	" " "	؟	؟	؟	گنپت ص ۲۸۱
۱۷	تلسی کرت رامائن کا خلاصہ	" "	ودیا پرکاش، مراد آباد	۱۹۰۷ء	۴۰	زیدی ص ۱۹۱، گنپت ص ۲۸۱
۱۸	سندر کانڈ	" "	؟	؟	؟	گنپت ص ۲۸۱
۱۹	رامائن کا ایک سین	لکشمی نرائن جوہر بدایونی	؟	؟	؟	زیدی ص ۲۱۸ (اشوک واٹکا، سندر کانڈ)
۲۰	شری بالمیکی رامائن	پنڈت جے گوپال	ہند [illegible] بھنڈار دہلی	؟	۲۷۵	اردو، پبلک
۲۱	بال کانڈ و سندر کانڈ	حفیظ اللہ خاں سندیلوی	؟	۱۸۸۷ء	؟	زیدی ص ۲۳۹ (تیسرا ایڈیشن)
۲۲	ادبھت رامائن	جگن ناتھ خوشتر	؟	؟	؟	پریم
۲۳	نوین سنگیت رامائن	بیدی لال چند دل	بیری آرٹ پریس، دہلی	۱۹۶۰-۱۹۶۱ء		بخشش (ڈراما کے طرز پر دس حصوں میں)
۲۴	بالمیکی رامائن	دوارکا پرشاد	؟	؟	؟	پبلک
۲۵	دیا ساگر یعنی اردو میں تلسی کرت رامائن	دیا شنکر	؟	؟	؟	فرخ ص ۹۶
۲۶	بالمیکی رامائن	دیبی پرشاد	نولکشور، لکھنؤ	۱۹۱۶ء	۷۶	عبدالحق
۲۷	رامائن بالمیکی	دیبی چند	لکھنؤ	؟	؟	اردو
۲۸	رامائن	راج گوپال اچاریہ	؟	؟	؟	اردو (الہ آباد کی اکیڈمی علمی کمیٹی چھاپنے کا ارادہ رکھتی تھی، معلوم نہیں چھپی یا نہیں)

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف / مترجم	ناشر / مطبع	سنہ طباعت	صفحات	کیفیت
۲۹	بال رامائن	راجہ شیکھر	؟	؟	؟	فرخ ص
۳۰	رامائن	رام جی مل کپور سنبھلی آرام	نولکشور	۱۹۲۵ء	؟	اردو (بطرز ناول)
۳۱	رامائن	پروفیسر رام سروپ	کنشاٹل پریس، لاہور	؟	۳۴۷	اردو، عبدالحق
۳۲	سہائی رامائن	رام سہائی کپور	؟	۱۹۱۴ء		بخشش (ڈراما۔ گیارہ حصوں میں)
۳۳	گاین سہائی رامائن	" "	؟	؟	۱۱۶	سہائی (جملہ رامائن کے رزم و بزم و کرم و دھرم کے پورے واقعات بھجنوں کے روپ میں)
۳۴	تلسی رامائن	پنڈت رام شرن داس	بھائی چتر سنگھ جیون سنگھ امرتسر	؟	[illegible]	بخشش
۳۵	رامائن (منظوم)	رامیشور دیال	؟	؟	؟	اردو
۳۶	رتن رامائن (منظوم)	رتن چند	؟	۱۹۵۳ء	؟	آزاد
۳۷	رام گیتا	شیو پرشاد ساحل	؟	؟	؟	رامائن
۳۸	رامائن سجھتا کرن	سورداس	لکھنؤ	؟	؟	اردو، عبدالحق
۳۹	رامائن	شانتی نرائن	روشر پرنٹنگ ورکس لاہور	۱۹۲۳ء	؟	اردو، عبدالحق
۴۰	مسدس رامائن	بنواری لال شعلہ علی گڑھی	؟	؟	؟	رامائن گنپت ص [illegible]
۴۱	والمیک رامائن	منشی سکھ دیال سنگھ شوق	مطبع برن پرکاش	۱۸۹۸	۳۶	صمد (بطرز ناول)
۴۲	بالمیکی رامائن	شیو برت لال ورمن	آزاد بکڈپو، امرتسر	؟	۲۸۰	بخشش
۴۳	بچوں کے لیے رامائن	منشی شیو ناتھ رائے کوشل	؟	؟	؟	مہابھارت
۴۴	رامائن (منظوم)	پنڈت بشمبر ناتھ صابر	؟	؟	؟	اردو، رفیق ص [illegible]، زیدی ص [illegible]، کشمیر ص ۵۴۱، موج ص ۲۵۲

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مترجم	ناشر/مطبع	سنہ طباعت	صفحات	کیفیت
۴۵	رامائن کے چھ ورق	طالب الہ آبادی	؟	؟	؟	اردو
۴۶	رامائن کے بعض سین	عبدالستار، بی۔اے	دلگداز پریس، لکھنؤ	۱۹۱۵ء	۴۷	رضا
۴۷	رامائن نظم اردو	کالکا پرشاد	نولکشور، لکھنؤ	؟	؟	عبدالحق
۴۸	پوتھی رامائن قلمی	کوچین سنگھ		ت ۱۲۴۳ھ	۲۰۲	اردو، عبدالحق (آزاد لائبریری، علی گڑھ میں موجود ہے)
۴۹	رامائن (منظوم)	گوبند	؟	؟	۴۳۲	بخش
۵۰	رامائن آنند پرکاش	پنڈت لچھمی دت	رام پریس، میرٹھ	؟	۱۸۶۸	بخش
۵۱	گورامنگل رامائن قلمی	ملہار راؤ بہادر	؟	؟	۱۲۹	ق راجستھان
۵۲	رامائن	جانکی پرشاد بیکس آتش بریلوی	؟	؟	؟	پالوی ص۱۰۱، زیدی ص۹۵، عشرت ص۱۱۳، موج ص۳۴۲
۵۳	سانگ رامائن	لالہ نند لال	مطبع مخزن قانون پریس، مظفر نگر	؟	؟	بخش (چوپائی کے فارم میں، ہر کانڈ علیحدہ علیحدہ کتابچے کی صورت میں)
۵۴	رام چرتر مانس (سندر کانڈ)	وشنو پرکاش ورند رجانی، سیتاپوری	کانپور	۱۹۷۸ء	۶۸	بخش
۵۵	شفقت برادری	وشنو کمار گوہا	مطبع سنسکرت	۱۹۰۰ء	۵۹	رنجن ص۲۸۱ (رامائن کا حصہ)
۵۶	رامائن سندر بھجنوں میں	ہری رام کپور گجراتی	مطبع پنجاب نیشنل سٹیم پریس، لاہور	؟	۸۴	بخش (بھجن کے فارم میں مکمل رامائن)

جزوی رامائن

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مترجم	ناشر/مطبع	سنہ طباعت	صفحات	کیفیت
۱	اختصار حقیقت معروف رام لیلا (منظوم)	ڈوری لال برق	قیصر ہند پریس، بدایوں	۱۹۱۰ء	۳۲	بخش
۲	ادھ بدھ رام چرتر	نین سکھ داس	لکشمی پریس دہلی	۱۹۱۵ء	۳۶	بخش
۳	پیام راحت رام کتھا	سہاگ مل سائینی	ہاندہ پریس، جالندھر	؟	۳۰۸	رضا

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مترجم	ناشر/مطبع	سنہ طباعت	صفحات	کیفیت
۴	جانکی چرتر	منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی	؟	؟	؟	افق ص۱۷۹
۵	دھنش دھاری رام	پنڈت بلک راج جی شرما آنند	؟	۱۹۴۵ء	۲۹۶	بخش
۶	راجہ جنک کا سنباد	؟	؟	۱۸۸۶ء	؟	عبدالحق
۷	رامائن کی کتھا	شانتی نرائن	؟	۱۹۳۳ء	۱۲۰	عبدالحق
۸	رام بن باس	پربھو دیال گپتا	؟	؟	۲۷۸	بخش
۹	رام بن باس	شردھے پرکاش دیو	؟	؟	؟	پبلک، عبدالحق
۱۰	رام جنم	رام سہائے تمنا لکھنوی	؟	؟	؟	زیدی ص۱۹۱
۱۱	رام چرچا	پریم چند	لاجپت رائے اینڈ سنز، لاہور	۱۹۲۹ء	۳۲۷	ادبیات ہرا ص۱۷۰، رضا، عبدالحق
۱۲	رام رس پنج ادھیائے	رام سہائے تمنا لکھنوی	؟	؟	؟	زیدی ص۱۹۱
۱۳	رام سگریو کی مترتا	رادھے شیام	ابو العلائی اسٹیم پریس، آگرہ	۱۹۱۹-۲۰ء	؟	بخش
۱۴	رام کتھا	منشی بال کرشن سہائے تمنا رسولپوری	؟	؟	؟	پالوی ص۲۳۲
۱۵	رام کہانی حصہ اول و دوم	حفیظ الدین	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۴۳ء	۱۵+۱۵	ادبیات ہرا ص۱۶۴، جامعہ، عبدالحق
۱۶	رام کہانی	نفیس خلیلی	؟	؟	؟	رامائن
۱۷	رام لیلا	مسٹر وی۔ پی۔ طالب	فیض عام پریس، لکھنؤ	۱۹۰۵ء	۱۶	صمد
۱۸	رام لیلا قلمی	گیا سی رام شاستری	؟	؟	؟	رضا
۱۹	رام نمبر	روزنامہ ہند وسہاگ، دہلی	ہند وسہاگ پریس، دہلی	۵ اپریل ۱۹۴۶ء	۹۶	بخش
۲۰	رام درشا دو حصہ	رام تیرتھ مرتب: آر ایس گنا رائن	؟	؟	؟	پبلک
۲۱	راون ودھ	رادھے شیام	شری رادھے شیام پریس، بریلی	۱۹۲۲ء	۳۲	صمد

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مترجم	ناشر/مطبع	سنہ طباعت	صفحات	کیفیت
۲۲	سری رام چندر جی	تاجور نجیب آبادی	؟	؟	؟	عبدالحق
۲۳	سری رام چندر جی	دیا رام سوبھا رام	؟	؟	؟	عبدالحق
۲۴	سری رام چندر جی	میلا رام وفا	شمشیر سنگھ اینڈ سنز لاہور	؟	۱۰۴	بخش (بچوں کیلئے لکھی گئی)
۲۵	سری رام مہاتم	سوامی دیال	؟	؟	؟	پریم
۲۶	سوانح عمری مہاراجہ رامچندر جی	؟	؟	؟	؟	بخش (ناقص الاول وناقص الآخر ہے اس لیے تفصیل کا علم نہ ہوسکا)
۲۷	سہا رام مہاتم	رگھبیر دیال	مطبع نولکشور لکھنؤ	؟	۳۱۶	عبدالحق
۲۸	سیتا بن باس	تناور سنگھ بیچین	؟	؟	؟	اردو (ڈراما کے فارم میں)
۲۹	سیتا پرتیاگ	منشی رام سہائے تمنا لکھنوی	؟	؟	؟	افق ص ۳۴، زیدی ص ۱۹۱، گپت ص ۲۸۱
۳۰	سیتا پرکاش	” ”	؟	؟	؟	زیدی ص ۱۹۱
۳۱	سیتا جی کی کھوج	رادھے شیام	ابو العلائی اسٹیم پریس	۲۰-۱۹۱۹ء	۴۴	بخش
۳۲	سیتا رام (منظوم)	طالب الہ آبادی	گیلانی الیکٹرک پریس لاہور	؟	۱۱۹	بخش
۳۳	سیتا سوئمبر ناٹک (منظوم)	گرودھر نرائن	مطبع نولکشور لکھنؤ	۱۸۷۷ء	۶۶	بخش
۳۴	سیتا سوئمبر	گھنشیام رائے	؟	؟	؟	عبدالحق
۳۵	سیتا ہرن	رادھے شیام	ابو العلائی اسٹیم پریس، آگرہ	۲۰-۱۹۱۹	۴۴	بخش
۳۶	فسانہ رام وسیتا موسوم بہ نظم گلکام (قلمی)	احمد خاں غفلت رامپوری		۱۸۲۵ء ت ۱	۹۷	رضا
۳۷	سمی چرتر حصہ سوم	پنڈت گنیش داس	قیصر ہند پریس دہلی	۱۹۲۵ء	۱۷۴	بخش (راجہ جنک کی بیوی جانکی مہارانی کا تذکرہ)
۳۸	لنکا دہن	رادھے شیام	ابو العلائی اسٹیم پریس آگرہ	۲۰-۱۹۱۹ء	؟	بخش
۳۹	مہاراجہ رامچندر جی	دیا رام	؟	؟	؟	عبدالحق
۴۰	ہنومان چالیسا	بابو رام پرشاد لال	مطبع نولکشور لکھنؤ	؟	؟	جوگ
۴۱	ہنومان چالیسا حصہ اول دوم سوم	بھگوتی پرشاد ریحاں نور گورکھپوری	؟	؟	؟	زیدی ص ۱۹۴، ۲ موج ص ۱۸۰
۴۲	ہنومان چرتر (تین حصوں میں)	بہاری لال	مطبع برن پرکاش بلند شہر	۱۹۰۳ء	۱۳۸+۱۰۲+۹۲	بخش (ناول)

اخبارِ علمیّہ

قرآن مجید کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ ہر دور میں اس کی حفاظت واشاعت کے مختلف وسائل وذرائع پیدا ہوتے رہے ہیں، موجودہ زمانے میں قرآن مجید کی طباعت اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمہ وتفسیر کی اشاعت جس طرح ہو رہی ہے وہ باعث حیرت ہونے کے علاوہ موجب مسرت بھی ہے، ترکی کے ادارہ IRCICA کے ترجمان NEWS LETTER کے تازہ شمارہ سے معلوم ہوا کہ ادارہ نے قرآن مجید کے زبانی ترجموں (ORAL TRANSLATIONS) کا کام شروع کیا ہے، اور اس سلسلہ میں WOLOF (وولوف) زبان میں یہ کام مکمل بھی ہو گیا ہے، افریقہ کی دو اور مقامی اور مقبول زبانوں TAMASHEQ (تماشیق) اور SONGHAY (سان گھے) میں بھی زبانی ترجمے کا کام پورا کر لیا گیا ہے، ادارہ کو اس کے لیے سینیگال اور مالی کے بعض مسلم اداروں کا تعاون بھی حاصل ہوا، مغربی افریقہ کی مساجد میں رمضان المبارک میں یہ رواج عام ہے کہ تراویح کے بعد قرآن مجید کی ترجمہ خوانی بڑے ذوق وشوق سے کی جاتی ہے، اس سلسلہ کے مفید ہونے کی وجہ سے اب ادارۂ مذکور نے دوسری زبانوں میں بھی قرآن مجید کے ترجموں کی ریکارڈنگ تیار کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔

رابطۂ عالم اسلامی کی خدمات قرآنی کا ذکر ان صفحات سے پہلے بھی آچکا ہے، اس لئے

مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کی طباعت کا فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے، لیکن اس کا دائرۂ عمل یہیں تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ علوم قرآنی پر بھی عمدہ اور مفید کتابوں کی اشاعت کے لیے سرگرم ہے، رسالہ التضامن الاسلامی کی ایک حالیہ اشاعت سے معلوم ہوا کہ رابطہ نے **من حدیث القرآن عن الإنسان**، **نور من القرآن فی طریق الدعوۃ والدعاۃ**، **فن التجوید**، اور **نظرات فی قصص القرآن** کے ناموں سے کتابیں شائع کی ہیں، ان میں اول الذکر کتاب ڈاکٹر علی محمد حسن العماری کے قلم سے ہے، اور یہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

ترکی میں اسلامی فنون لطیفہ سے متعلق پندرہویں صدی ہجری کے آغاز پر ۱۹۸۳ء میں ایک بین الاقوامی سیمینار ہوا تھا، اس میں اسلامی آرٹ کے مختلف مظاہر، فنون اسلامی کی تاریخ، اسلامی فن تعمیر اور دوسرے فنون اسلامیہ کے نظریاتی اور جمالیاتی پہلوؤں پر متعدد ماہروں، محققوں اور اصحاب فن نے داد تحقیق دی تھی، سیمینار اس درجہ کامیاب تھا کہ اسکو "فن اسلامی پر محضر استنبول" سے تعبیر کیا گیا تھا، جس میں فنون اسلامی کی ترقی اور اہل فن کی قدردانی کے متعلق بعض جدید خیالات و مباحث بھی پیش کیے گئے تھے، اب اس سیمینار کے تمام مقالوں کو مرتب کرکے IRCICA نے دار الفکر دمشق سے طبع کرایا ہے، کتاب میں انگریزی کے ۱۷، فرانسیسی کے ۱۰ اور عربی کے ۱۲ مقالے شامل ہیں، دیباچہ ترکی کے مشہور عالم و محقق ڈاکٹر اکمال الدین احسان اوغلو کے قلم سے ہے، اس میں سیمینار کے افتتاح و اختتام کی روداد بھی شامل کردی گئی ہے، کتاب میں ۱۳۹ تصویریں اور ۴۹ قلمی شہ پاروں کا عکس بھی دیا گیا ہے۔

اسلامی فنون لطیفہ اپنے حسن و نفاست اور خاص طور پر اسلامی فن تعمیر کے جلال و جمال کی وجہ سے ہمیشہ اہل علم کے لیے جاذب نظر اور پرکشش رہا ہے، پروفیسر سعود ماہر محمد کی تازہ کتاب "العمارۃ الاسلامیۃ علی مر العصور" بھی اسی سلسلۃ الذہب کی کڑی ہے انھوں نے اس میں اسلامی فن تعمیر کے خصائص و امتیازات اور اس کے اہم عناصر پر عہد بہ عہد بحث کی ہے، اور حق یہ ہے کہ موضوع کا نہایت عالمانہ تجزیہ کرکے اس کا حق ادا کردیا گیا ہے، کتاب میں فنون لطیفہ کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں، ایک DYNAMIC ART، جن کا تعلق چشم و گوش سے ہے، مثلاً موسیقی، شاعری اور رقص وغیرہ، دوسری قسم FORMAL ART ہے یعنی تعمیر، نقاشی اور مصوری وغیرہ، مصنف کے خیال میں اسلام میں تعمیر اور نقاشی و تزئین کاری پر زور دیا گیا ہے، نقاشی کا نمو، فن کارانہ تکنیک میں ہوا، مختلف معدنی اشیاء، سنگ مرمر، شیشہ اور موتی وغیرہ میں نقاشی کا عمل اعلیٰ درجہ کا ہوا، اور پینٹنگ کا اظہار، مناروں اور محرابوں میں بڑی خوبصورتی سے کیا گیا، کتاب دو جلدوں میں ہے، اور عمدہ و نادر تصویروں سے مزین ہے۔

ہندوستان میں بھی حال ہی میں ایک کتاب INDIA: A PAGEANT OF PRINTS نامی شائع ہوئی ہے، یہ کتاب دراصل اٹھارہویں صدی کے انگریز مصوروں کے فن پاروں کا منتخب مجموعہ ہے، جس میں بڑی نادر و نایاب تصویروں کو جمع کرکے گویا ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے ابتدائی دنوں کی منہ بولتی تاریخ پیش کردی گئی ہے، ان تصویروں میں ٹیپو سلطان کے جاہ و جلال کا عکس صاف نمایاں ہے، ٹیپو سلطان کے بچوں کے یرغمال بنائے جانے اور سرنگاپٹم کے

کے معرکہ کے واقعات جس مہارت اور چابکدستی سے پیش کیے گئے ہیں، ان سے انگریزوں کے اعصاب پر ٹیپو سلطان کی ہیبت چھانے کی بھی عکاسی ہوتی ہے، معرکہ سرنگاپٹم کی ایک تصویر تین حصوں میں ہے، رابرٹ پورٹر کی اس تصویر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اصلاً ساڑھے چھتیس میٹر لمبی تھی، زندگی کے کینوس کی طرح وسیع اس تصویر میں سیکڑوں نقوش نمایاں کیے گئے ہیں، انگریز اپنے دور اول میں ہاتھیوں اور گینڈوں کو جس حیرت کی نظر سے دیکھتے تھے اس کے نقوش بھی ان تصویروں میں مرتسم ہیں، کتاب میں صرف دو ہندوستانی مصوروں کی تصویریں ہیں، باقی سب انگریز مصوروں کے رنگ و روغن کی نمائندہ ہیں، تصاویر کے علاوہ لکڑی اور دھاتوں پر نقاشی اور سنگی طباعت کی تاریخ پر معلومات ہیں، نقشہ سازی پر بھی ایک باب ہے، بمبئی کے اولین مطبع قائم شدہ ۱۷۷۲ء کے متعلق بھی معلومات فراہم کیے گئے ہیں، اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کی یہ مصور تاریخ واقعی بیش قیمت ہے، اسی لیے اس کی قیمت ۷۵۰ روپیے ہے، مرتبین میں پالین روہتگی اور فیروزہ گاڈریج کے نام دیے گئے ہیں۔

کمال الدین عمر بن احمد ابن العدیم، ساتویں صدی ہجری کے ایک باکمال مورخ، محدث اور انشاپرداز ہیں، ان کی دو کتابیں "بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب"، اور "الخط الجمیل" فن تاریخ میں معروف کتابیں ہیں، حال ہی میں جامعہ حلب کے معہد التراث العلمی العربی نے ان کی ایک کتاب "الوصلۃ الی الحبیب فی وصف الطیبات والطیب" کے نام سے شائع کی ہے، کتاب کے خوبصورت نام سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ ادب، شعر یا معاملات قلب و نظر سے متعلق ہے، مگر اصلاً یہ طب اور علم الاغذیہ

سے متعلق بڑی دلچسپ کتاب ہے، عطریات، مشروبات، مائیات اور ان کے ممزوجات شیرینی، نمک، سرکہ، عفونت کش اشیاء، صابون سازی، تقطیر ماء وغیرہ کے متعلق ابواب قائم کیے گئے ہیں، اور ابن العدیم کے مجربات بھی شامل کیے گئے ہیں، دودھ سے تیار شدہ کھانوں، سموسہ اور اسی قسم کے دیگر پکوان کے طریقوں کا بھی ذکر ہے، حلوہ جات کے ذکر میں خاتونیہ، مکشوفہ، مامونیہ، ہریسۃ الفستق، فستقیہ، معمول التمر، وکل واشکر، اللوذینج، الکعک جیسی مٹھائیوں کا تذکرہ ہے، جن سے کام و دہن کی شادکامی کے علاوہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے تمدن اور معاشرت کی جھلک بھی سامنے آتی ہے، اس بیش قیمت کتاب کو جدید ترین انداز پر سلیمی محجوب اور دریۃ الخطیب نے ایڈٹ کیا ہے، مصنف کے حالات، دوسرے مخطوطات سے مقابلہ و تطبیق اور تحقیق کے بعد نہایت سلیقہ اور نفاست سے پیش کیے گئے ہیں، سہولت کے لیے جدولیں اور اشارے بھی دیے گئے ہیں۔

بابری مسجد کے قضیہ میں غیر مسلم دانشوروں کے مثبت رویہ کا ذکر ان صفحات میں کیا جاتا رہا ہے، تعصب، ہٹ دھرمی اور مسلمہ حقائق کے انکار کی ظلمتوں میں عدل و انصاف اور تاریخی صداقتوں کے اقرار کی یہ چند کرنیں بھی غنیمت ہیں، اب معلوم ہوا ہے کہ مشہور مورخ پروفیسر رام شرن شرما کی کتاب COMMUNAL HISTORY AND RAMA'S AYODHYA آئندہ ماہ تک طبع ہو جائے گی، پروفیسر موصوف کے غیر جانبدارانہ مطالعہ اور تاریخ ہند قدیم پر ان کی گہری نظر کی شہرت کی وجہ سے ہم اس کتاب کا انتظار اور استقبال کرتے ہیں، ان کے ایک اہم انٹرویو کی تلخیص بھی قارئین معارف کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی جو آئندہ اشاعت میں شامل کی جا رہی ہے۔

"ع۔ص"

وفیات

جناب پروفیسر مشیر الحق مرحوم

از حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

دار المصنفین اور پوری علمی دنیا میں جناب پروفیسر مشیر الحق مرحوم وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کے سانحہ قتل کی خبر نہایت رنج و غم کے ساتھ سنی گئی، ان کو یرغمال بنائے جانے کی خبر ہی باعث تشویش و اضطراب تھی، لیکن یہ امید نہ تھی کہ ایک حلیم الطبع، نرم خو، شائستہ و شگفتہ مزاج انسان کے خرمن ہستی کو آتش جنار اس طرح جلا کر خاک کر دے گی۔

ان کی زندگی ماہ و سال کے لحاظ سے بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن محنت، صبر، استقلال، عزم اور مقصد کی یافت کے لحاظ سے یہ حیات مختصر بڑی قابل قدر اور قابل رشک رہی۔

ان کے علمی سفر کا آغاز دار العلوم ندوۃ العلماء کی طالب علمی سے اور اختتام کشمیر یونیورسٹی کی وائس چانسلری پر ہوا، حق یہ ہے کہ قدیم و جدید کے خوشگوار اور متوازن امتزاج کی یہ دلکش مثال ہے،

وہ غازی پور یوپی کے قصبہ بحری آباد میں پیدا ہوئے، کم عمری میں والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے، تعلیم کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ آئے، یہاں سے عالمیت کی سند لی، انھوں نے انگریزی تعلیم پر بھی توجہ کی اور بڑے نامساعد حالات اور سخت معاشی پریشانیوں کے باوجود انھوں نے علم و فن کی تحصیل جاری رکھی انکے علمی شوق و ذوق تھی

کو ان کے محبوب و مشفق استاذ مولانا عبد السلام قدوائی ندوی مرحوم کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کبھی کم نہ ہونے دیتی، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی اے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا، سنہ ۶۱ء میں انھوں نے کناڈا کی میک گل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند بھی حاصل کی، دوران تعلیم ان کے قلب و نظر پر مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر سید عابد حسین اور پروفیسر الفرڈ کینٹویل اسمتھ کے نقوش خاص طور پر مرتسم ہوئے،

پٹیالہ اور مسلم یونیورسٹی میں کچھ عرصہ تک تدریسی ذمہ داریاں انجام دینے کے بعد وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ اسلامیات و عرب ایرانین اسٹڈیز کے صدر ہوئے سنہ ۸۷ء میں وہ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

ان کی زندگی کا زیادہ حصہ درس و تدریس میں گذرا لیکن اس کے باوجود وہ تصنیف و تالیف کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے، شروع میں انھوں نے مولانا عبد السلام قدوائی ندوی مرحوم کی زیر نگرانی بچوں کے لیے صحابہ کرامؓ کے حالات بڑے موثر انداز میں تحریر کیے تھے جو ادارۂ تعلیمات اسلام لکھنؤ سے شایع ہوئے یہیں سے سنہ ۴۸ء میں مولانا قدوائی مرحوم نے پندرہ روزہ 'تعمیر' جاری کیا جس کے مدیروں میں انکے اور مولانا ابو الحسن علی ندوی صاحب کے علاوہ مشیر صاحب کا نام بھی تھا جس میں وہ مضامین کے علاوہ افسانے بھی لکھتے تھے، جامعہ ملیہ اور پھر میک گل یونیورسٹی نے ان کے فکر و نظر کو مزید وسعت دی، سنہ ۷۲ء میں ان کی کتاب 'امریکہ کے کالے مسلمان' شایع ہوئی جو مختصر ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب تھی، سنہ ۷۳ء میں ان کی ایک اور کتاب 'مسلمان اور سیکولر ہندوستان' شایع ہوئی، اس میں مذہب، سیکولرزم، دینی تعلیم، دینی رہنمائی، قانون اور شریعت جیسے موضوعات پر انھوں نے دعوت

غور و فکر وہی ہے لیکن اس میں ظاہر کیے گئے بعض خیالات سے سنجیدہ علمی و دینی حلقوں کو اختلاف رہا، ۱۹۸۰ء میں 'مذہب اور جدید ذہن' کے نام سے جب ان کے چند مضامین کا ایک مجموعہ طبع ہوا تو اس سے بھی اصحاب علم و دین نے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا وہ بظاہر جمود پسند ذہنوں میں ہلچل پیدا کرنے کے لیے اس قسم کے مضامین لکھتے تھے، لیکن اہل علم ان کے ضرر رساں پہلوؤں کو بھانپ لیتے تھے ان کو بھی معروضیت میں غلو تھا، سمیناروں میں ان کی موجودگی ضروری خیال کی جاتی، انکے مقالوں پر مباحثہ و مناقشہ زیادہ ہوتا، لیکن وہ اپنے خیالات کو تسلیم کیے جانے پر کبھی اصرار نہیں کرتے اور اپنے نرم لہجہ، متبسم چہرہ اور کسی تیکھے جملہ سے مجلس میں جان پیدا کر دیتے۔

۱۹۸۲ء میں دارالمصنفین میں ہونے والے مستشرقین پر بین الاقوامی سمینار میں وہ بھی شریک ہوئے اور اپنے استاذ اور مشہور مستشرق کینٹویل اسمتھ کے حالات میں ایک مقالہ پڑھا، جس پر خاصی بحث ہوئی، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے سمینار کی روداد میں ان کے متعلق بڑی محبت سے لکھا کہ "ڈاکٹر مشیر الحق ندوی ابھی جوان ہیں ان کے مقالہ نگاری میں جوانی کی ساری ترنگیں اور امنگیں ہوتی ہیں"۔

ان کے بعض علمی و مذہبی خیالات محل نظر ہو سکتے ہیں، لیکن ان کی شرافت، مروت، دل نوازی اور نرم خوئی مسلّم تھی، وہ بڑی بے ساختہ اور بے تکلف گفتگو کرتے تھے جس سے نہ عہدہ و منصب کی بڑائی کا اندازہ ہوتا تھا اور نہ کسی قسم کی رعونت کا اظہار ہوتا تھا، دنیوی وجاہت و ترقی کے مدارج طے کرنے کے بعد بھی انھوں نے اپنے قدیم بزرگوں اور دوستوں سے ربط و تعلق میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

گذشتہ دسمبر میں غالب اکیڈمی دہلی میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مرحوم کی یاد میں ایک سمینار ہوا تو اس کی صدارت کے لیے وہ خاص طور پر کشمیر سے آئے اور دن بھر سمینار کی نشستوں میں موجود رہے، دارالمصنفین سے ان کی گہری واقفیت اور غیر معمولی اخلاص و تعلق کا علم اس دن کی انکی تقریر سے ہوا، جس کی لذت آج تک فراموش نہیں ہو سکی ہے۔

ادھر کشمیر میں سیاسی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے، کشمیریوں کے ایک طبقہ کا عرصہ سے یہ احساس ہے کہ

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر

مگر اس کے لیے مشیر صاحب کے خون ناحق کا وبال لینا سراسر نادانی ہے، حکومت کشمیر کا رویہ بھی بعض حلقوں میں مستحسن نہیں سمجھا گیا، ایک قیمتی جان کو بچانے کے لیے جس ذمہ داری کی ضرورت تھی اس کو خاطر خواہ پورا نہیں کیا گیا، بہر حال قضا و قدر کا فیصلہ یہی تھا، وہ اب اپنے رب کے حضور میں ہیں، رمضان المبارک کے مہینہ میں مظلومیت و بے کسی کے عالم میں انھوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اور ان کی اہلیہ، صاحبزادیوں اور دوسرے تمام اعزہ و احباب کو صبر کی توفیق دے، آمین، جامعہ ملیہ کے گور غریباں میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کی لوح مزار پر کندہ یہ آیت ان کو بہت پسند تھی، کیا عجب آج ان کی قبر سے یہی صدا آتی ہو۔

یالیت قومی یعلمون بما غفر لی ربی وجعلنی من المکرمین

ادبیات

روزہ

از

جناب عروج زیدی مرحوم، رام پور،

(۱)

السلام اے ماہِ یزداں! بابِ رحمت السلام — السلام اے کاشفِ سرِ عبادت! السلام

السلام اے شاہدِ شانِ رسالت! السلام — السلام اے آئینہ دارِ مشیت! السلام

رخصتی لمحات اگرچہ ہیں دلِ مومن پہ شاق

الوداع والفراق والوداع والفراق

(۲)

السلام اے پاسبانِ قصرِ ایماں! السلام — السلام اے داعیِ تعلیمِ قرآں! السلام

السلام، اے حاملِ تقدیسِ عرفاں! السلام — السلام اے مظہرِ انوارِ یزداں! السلام

رخصتی لمحات اگرچہ ہیں دلِ مومن پہ شاق

الوداع والفراق والوداع والفراق

(۳)

"روزہ" اک بابُ العبادت[1] ہمیں معلوم ہے — نفسِ سرکش سے بغاوت ہو ہمیں معلوم ہے

[1] لکل شیی باب وباب العبادۃ الصوم فرمانِ رسولؐ (ہر چیز کیلیے ایک دروازہ ہوتا ہے اور عبادت کا دروازہ روزہ ہے)

باعثِ اکرام و عظمت ہے ہمیں معلوم ہے — اور اب ہنگامِ رخصت ہے، ہمیں معلوم ہے

رخصتی لمحات اگرچہ ہیں دلِ مومن پہ شاق

الوداع والفراق والوداع والفراق

(۴)

روزہ داری ہے ہمیں اونچا اٹھانے کے لیے — ہم کو راہِ رحمتِ باری دکھانے کے لیے

ڈھال ہے ہم کو برائی سے بچانے کے لیے — قطرۂ بے آب کو گوہر بنانے کے لیے

رخصتی لمحات اگرچہ ہیں دلِ مومن پہ شاق

الوداع والفراق والوداع والفراق

(۵)

فیضِ ماہِ صوم سے ہر سمت و نخاوند ہیں — فیضِ ماہِ صوم سے سارے شیاطیں بند ہیں

فیضِ ماہِ صوم سے ہم کس قدر خورسند ہیں — فیضِ ماہِ صوم سے ہم صبر کے پابند ہیں

رخصتی لمحات اگرچہ ہیں دلِ مومن پہ شاق

الوداع والفراق والوداع والفراق

(۶)

تیرے دم سے دور رہتے ہیں گناہ و منکرات — بزمِ روزہ دار میں روشن ہے فانوسِ نجات

آدمی روزہ سے ہے محبوبِ ربِ کائنات — سال بھر ترسائیں گی ہم کو یہ نوری کیفیات

رخصتی لمحات اگرچہ ہیں دلِ مومن پہ شاق

الوداع والفراق والوداع والفراق

……………

مطبوعات جدیدہ

اترپردیش اردو اکادمی کا سلسلہ ابوالکلام صدی تقریبات

(۲)

انتخاب خطبات حسرت موہانی: مرتبہ مفتی محمد رضا انصاری صاحب، صفحات:

۱۳۶ — قیمت دس روپیے

یہ تحریک آزادی کے مشہور رہنما مولانا حسرت موہانی کے خطبات کا انتخاب ہے، اس کے شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے ایک پُر از معلومات مقدمہ ہے، جس میں مولانا کی سیرت و شخصیت کے خط و خال نمایاں کیے گئے ہیں، اور سیاست نیز شعر و ادب میں انکی عظمت دکھائی گئی ہے، یہ مقدمہ مولانا کی انقلابی اور سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ اس دور کی قومی و سیاسی جد و جہد کا مرقع بھی ہے، اکادمی نے یہ کتاب اسی لیے شائع کی ہے کہ اس میں اس عہد کی مکمل تصویر آگئی ہے جس میں مولانا آزاد کی مجاہدانہ سرگرمیاں منتہائے کمال پر تھیں؛

انتخاب مدینہ بجنور: مرتبہ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی صفحات ۴۴ ، قیمت ۱۲/-

سہ روزہ مدینہ بجنور الہلال اور ہمدرد کا معاصر اور ان ہی کی طرح قوم پروری میں ممتاز تھا، اس نے ان دونوں سے زیادہ عمر پائی، اور اسے تقریباً نصف صدی تک ملک و قوم کی خدمت کا موقع ملا، اور اس سے نامور اہل قلم وابستہ رہے، مدینہ کے مشمولات کے انتخاب کی اشاعت سے نئی نسل کو فیضان حاصل ہوگا، مقدمہ میں

تحریک آزادی میں مدینہ کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

انتخاب زمیندار: مرتبہ پروفیسر عتیق احمد صدیقی صفحات ۱۰۰، قیمت ۱۳ روپیے

"زمیندار" مولانا ظفر علی خان مرحوم کا مشہور و مقبول اخبار ہے، جو تحریک آزادی و حریت کا بیباک ترجمان اور انقلاب پسند تھا، اس میں قومی جد و جہد اور تحریک آزادی کے بارے میں جو مواد موجود ہے، اکادمی نے مولانا آزاد صدی کے موقع پر اس کا انتخاب شائع کیا ہے، تاکہ موجودہ نسل اس سے بے خبر نہ رہے، مقدمہ میں "زمیندار" کے اجرا، اغراض اور انقلابی خدمات کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔

الہلال کے منتخب افسانے: مرتبہ ایم۔ کوٹھیاوی راہی صاحب،

صفحات ۱۲۸۔ قیمت دس روپیے

سنہ ۲۷ء میں جب الہلال دوبارہ شائع ہوا تو اس میں بکثرت افسانے بھی شائع ہوئے جو دوسری زبانوں سے ترجمہ کیے جاتے تھے، اکادمی نے ان کا انتخاب شائع کرکے انھیں محفوظ کر دیا ہے، مقدمہ میں الہلال کے افسانوں سے متعلق مفید باتوں کا ذکر ہے، راقم کو پروفیسر محمود الٰہی کے اس دعویٰ کو تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ "افسانہ دیکھ بیوگ کا بشپ اور تاریخ اسلام کا بغدادی مولانا آزاد کے زور قلم کا نتیجہ ہے"۔ اسی لیے لائق مرتب بھی اس سلسلہ میں "لیکن حتمی طور پر ان کا فیصلہ کرنا ایک کار دشوار ہے" لکھ کر گذر گئے ہیں۔

انتخاب خطبات جمعیۃ علمائے ہند: مرتبہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

صفحات ۱۷۲۔ قیمت ۱۳ روپیے۔

ملک کی آزادی و اتحاد کی تحریک میں جمعیۃ علمائے ہند کی زریں خدمات ناقابل فراموش

ہیں، اس کتاب میں اس کے بعض اجلاس کی کاروائی اور خطبات صدارت کا انتخاب
شائع کیا گیا ہے، اس میں مولانا آزاد کے بھی دو خطبے شامل ہیں، اس انتخاب سے ملک کی
آزادی میں علماء کی سرفروشی اور مجاہدانہ کارناموں کی تصویر سامنے آجاتی ہے، مقدمہ میں
جمعیۃ علماء کی جدوجہد اور تحریک آزادی کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔

انتخاب ھمدرد: مرتبہ جناب صباح الدین عمر صاحب صفحات ۱۹۲

قیمت ۱۵ روپیے

اتر پردیش اردو اکادمی نے جنگ آزادی پر مستند مواد فراہم کرنے کا جو منصوبہ بنایا
تھا، اس کی ایک کڑی یہ بھی تھی کہ آزاد صدی کے موقع پر تحریک آزادی میں اردو اخبارات
کی خدمات کا جائزہ لیا جائے، اور ان کے انقلابی مضامین کا انتخاب شایع کیا جائے،
اس اعتبار سے مولانا محمد علی مرحوم کا ہمدرد دستاویزی حیثیت کا حامل اخبار تھا جس کے
مضامین کی ترتیب و انتخاب کا کام جناب صباح الدین عمر نے محنت و خوبی سے انجام
دیا ہے، اور اپنے مقدمہ میں مولانا محمد علی کے معیار صحافت، ہمدرد کی سرگذشت،
اور آزادی کی تحریک میں اس کی خدمات تحریر کی ہیں۔

مولانا آزاد کا نظریۂ صحافت: مرتبہ جناب قطب اللہ صاحب،

صفحات ۱۶۰ - قیمت بارہ روپیے

اس میں مولانا ابوالکلام کی وہ منتخب تحریریں جمع کی گئی ہیں جن سے صحافت میں
ان کا نقطۂ نظر، مقصد و مشن اور دوسرے صحافیوں پر ان کا تفوق و امتیاز ظاہر ہوتا ہے
مقدمہ میں ان باتوں کی وضاحت کے علاوہ ہندوستان میں صحافت کی ابتدا و ارتقا
اور اسے معیاری بنانے میں مولانا کا حصہ دکھایا گیا ہے۔

کمال ابوالکلام: مرتبہ جناب علی جواد زیدی صاحب، صفحات ۱۴۴

قیمت ۱۱ روپیے

اردو کے مشہور محقق و نقاد جناب علی جواد زیدی مولانا آزاد کے صرف عقیدتمند ہی
نہیں بلکہ ان کے پورے عظمت شناس بھی ہیں، سرکاری مشغولیتوں کے باوجود وہ وقتاً
فوقتاً مولانا کی شخصیت اور کارناموں کے مختلف پہلوؤں پر مضامین تحریر فرماتے رہے
ہیں، اب اکادمی کی خواہش پر مولانا کی صدی تقریبات کے سلسلہ میں انھوں نے اپنے
مضامین کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے جو آزاد شناسی کے لیے مفید و معاون ہے گا، یہ مجموعہ
آزاد صدی کا اہم تحفہ ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی نے مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات کے موقع پر ان
کتابوں کو شائع کر کے مولانا کو جو مخلصانہ خراج عقیدت پیش کیا ہے، اس سے ان کے فکر و فن
سے متعلق جو مواد منتشر یا کمیاب تھا، وہ یکجا ہو گیا ہے، ان کتابوں سے مولانا کی شخصیت
اور افکار و نظریات کی قدر و قیمت کا صحیح تعین بھی ہوگا، اور ہماری قومی تحریک اور
ملک کی آزادی کی مستند تاریخ بھی سامنے آئے گی۔

تبسم اور آم کے آم: مرتبہ جناب رام لعل نابھوی صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت
و طباعت عمدہ، صفحات اول ۱۴۰ اور دوم ۱۰۱ مجلد مع گرد پوش،
قیمت بالترتیب ۲۵ و ۳۵ روپیے پتہ از مصنف محلہ دیوان نابھا، ۲۰۱، ۷ سما پنجاب۔

جناب رام لعل نابھوی ہندی، سنسکرت اور فارسی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں،
اردو تو ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، طنز و مزاح اور انشائیہ نگاری میں انھوں نے اپنے جوہر
زیادہ دکھائے ہیں، زیر نظر کتابیں ان اصناف ادب کا دلکش نمونہ ہیں، پہلی کتاب تبسم

طنزیہ ومزاحیہ خاکوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جس کے دو اڈیشن شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں اب تیسرا اڈیشن مزید اضافوں کے بعد چھپا ہے اور ۲۲ مضامین پر مشتمل ہے، اس میں پہلے اردو ادب میں طنز ومزاح کا مختصر جائزہ لے کر اس کی حقیقت، دوسری زبانوں میں اس کے رواج اور اردو میں اس کی ابتدا اور ارتقا کا حال بیان کیا گیا ہے پھر ایک سے بڑھ کر ایک مزاحیہ خاکے دیے گئے ہیں جن میں سماج کے مختلف طبقوں کے علاوہ خود اپنے طبقہ ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کا ایسا خاکہ کھینچا ہے جو ان کے قد وقامت پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے، یہ سب مضامین اور خاکے خاصے کی چیز ہیں اور ان سے زندگی کے مختلف شعبوں میں پھیلی ہوئی بے اعتدالی اور مختلف النوع افراد میں پائی جانے والی ناہمواری کا مرقع سامنے آجاتا ہے، یہ خاکے سرور وانبساط پیدا کرنے کے علاوہ ہم کو سنجیدگی سے خرابیوں کی اصلاح اور ناہمواریوں کو دور کرنے کی دعوت دیتے ہیں،

دوسری کتاب آم کے آم مصنف کے انشائیوں کا مجموعہ ہے جسکا دوسرا اڈیشن اضافہ کے بعد شائع ہوا ہے اسمیں پہلے تو فن انشائیہ کا لغوی واصطلاحی مفہوم بتایا گیا ہے پھر اسکے آغاز وارتقا کی مختصر داستان سنائی گئی ہے انشائیے کے مقاصد اور انشائیہ نگاری کی خصوصیات دکھانے کے بعد طنز ومزاح سے اسکا فرق واضح کیا گیا ہے، یہ مجموعہ ان ۱۷ انشائیوں پر مشتمل ہے فیشن، پوسٹ کارڈ، انتظار، سایہ مسکراہٹ، حیرت، خوش آمدید، کاہلی، تنہائی، مسکہ، تصویر، خواب، لغزش، موت، ندامت، آم کے آم گٹھلیوں کے دام ان انشائیوں سے مصنف کے نظر ومشاہدہ کی قوت اور موجودہ معاشرتی حالات اور سماج کے مختلف طبقوں کے ذہنی مزاج، نفسیات اور طرز فکر سے گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ راقم کو یہ انشائیے پڑھنے کا موقع اسٹیشن پر ملا جہاں تقریباً ۵ گھنٹے تک مجھے ریل کا انتظار کرنا پڑا تھا اس لیے میں بھی لعل صاحب انشائیہ "انتظار" کا عملی لذت شناس ہوں، اس لذت نے مجھے انتظار کی کلفت کا احساس ہی نہ ہونے دیا یہ زبان کی خوبی ودلکشی اور طرز بیان کی بے ساختگی و دلآویزی مصنف کا طرۂ امتیاز ہے، یہ دونوں کتابیں قاری کی مسرت وبصیرت میں اضافہ کرتی ہیں۔

"ض"